اسلامی اقتصادیات

کا جائزہ

شہید راہ حق:

حضرت آیت اللہ سید محمد باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ

معراج کمپنی

بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

فہرست

عَرضِ ناشر

ابتدا ہے اپنے رب تعالیٰ کے نام سے جو حقیقت میں عبادت کے لائق ہے درود بنی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس پر کہ جن پر خدا اور اس کے فرشتے بھی درود بھیجتے ہیں، اور سلام ہے ان کی اولاد پر جو ہماری رہنما اور وصی ہیں۔

جناب شہید باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی میں اقتصادیات کے موضوع پر خصوصی طور پر کام کیا اور ان کی اقتصادیات کے موضوع پر شہرہ آفاق کتاب ''اقتصادنا'' علمی اور اقتصادی حلقوں میں جو مقام رکھتی ہے اس تک شاید اور کوئی نہ پہنچ سکے۔ اسی طرح ''اسلامی بینک'' بھی ایک انتہائی قابل قدر تصنیف ہے۔

زیر نظر کتاب ''اسلامی اقتصادیات کا جائزہ'' بھی ایک ایسی کتاب ہے جس کی جتنی ضرورت آج ہے شاید اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ مذکورہ کتاب کا ترجمہ جناب ذیشان حیدر جوادی صاحب نے کرنے کی سعادت حاصل کی ہے اور خدا کی رحمت سے اس کی اشاعت کی سعادت معراج کمپنی کے حصے میں آئی ہے۔

پیام اسلامی سنٹر کراچی کے مہتم محترم جناب سید فدا حسین رضوی نے ہماری توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ جناب شہید باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ کے گراں قدر کتب میں سے اس وقت کوئی کتاب بھی پاکستان میں دستیاب نہیں ہے جس سے محبان شہید باقر الصدر بہت افسردہ ہیں، نا صرف توجہ دلائی بلکہ کتب بھی مہیا کیں اگر یہ کہا جائے کہ یہ ساری کاوش

جناب سید فدا حسین رضوی صاحب کی ہے تو بے جا نہ ہوگا ادارہ ان کا انتہائی ممنون و مشکور ہے اوران کے دعا گو ہے۔ اللہ ان کی توفیقات خیر میں اضافہ فرمائے۔

ادارہ ان تمام افراد کا انتہائی ممنون و مشکور ہے جنہوں نے شہید باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ کے کتب کی فراہمی میں مقدور بھر کاوش وسعی انجام دی۔

اگر کسی کے پاس شہید باقر الصدر کی کوئی تصنیف موجود ہے تو ازراہ کرم ہمیں ارسال فرمادیں تاکہ اس کو شائع کیا جاسکے اور آپ اس کار خیر میں ہمارے رفیق کار ہوں اور دنیا اور آخرت کی منازل میں ترقی کا سبب بن جائیں۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

اسلامی اقتصادیات کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

اسلامی اقتصادیات کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

اسلامی مکتب فکر کے بعض رسالوں کی اشاعت کے بعد سے پڑھنے والوں کا برابر اصرار بڑھتا جارہا ہے کہ اس سلسلے کی دوسری کڑیاں بھی منظر عام پر لائی جائیں۔ خصوصیت کے ساتھ ''ہماری اقتصادیات'' کی پہلی جلد شائع ہوجانے جانے کے بعد یہ اصرار اور بھی شدید ہوگیا۔ اور میں اس مطالبہ کو ٹالتا رہا کہ ''ہمارے اقتصادیات'' کی دوسری جلد مکمل ہو جائے۔ ناظرین کرام کا اصرار بھی اسی بنیاد پر تھا کہ چھوٹے چھوٹے رسائل شائع ہوجائیں تو ذہن بڑی کتاب کو سمجھنے کے لئے تیار ہوجائیں۔

بہرحال اب میں اس رسالے کو شائع کررہا ہوں جس کا مقصد یہ ہے کہ مسائل کو بڑی حد تک وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے اور ان دقیق و عمیق پہلوؤں کو نظر انداز کردیا جائے جن کی تشریح بڑی کتاب میں کی گئی ہے۔

یہ رسالہ مفصل کتاب کے لئے ایک تمہید، خلاصہ اور فہرست کی حیثیت رکھتا ہے جس کا مقصد صرف ذہنوں کو آمادہ کرنا ہے اور مسائل کی راہ ہموار کرنا ہے اور بس۔

رسالہ کا مقصود صرف ایک سوال اور اس کے جواب کی وضاحت کرنا ہے اور بس۔

سوال یہ ہے کہ اسلام میں کوئی اقتصادی نظام پایا جاتا ہے یا نہیں؟

تفصیل موقع پر پہلے سوال کے پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے گا۔ اس کے بعد جواب کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ اس کے شواہد کا تذکرہ ہوگا۔ اور آخر میں ان اعتراضات کا تجزیہ کیا جائے گا جو ہمارے مثبت جواب کے مقابلہ میں پیش کئے جاتے ہیں۔

سوال کی وضاحت

اقتصادی نظام اور سسٹم سے مراد یہ ہے کہ معاشی زندگی کو عدالت وانصاف سے ہمکنار بنانے کے لئے کوئی طریقہ ایجاد کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اسلام نے ایسا کوئی طریقہ ایجاد کیا ہے یا نہیں؟

جس طرح کہ سرمایہ داری نے اس مسئلہ کو حل کرتے ہوئے معاشی آزادی کا نظریہ ایجاد کیا ہے اور اس کو اپنا بنیادی تصور قرار دیا ہے اسلام کے پاس ایسی کوئی بنیاد ہے یا نہیں؟

ضرورت

اس سوال کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اسلام نے سرمایہ داری اور اشتراکیت کے مقابلہ میں ایک منفی رُخ اختیار کیا ہے اور وہ دونوں میں سے کسی سے اتفاق رائے کرنے کا قائل نہیں ہے۔ ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا کہ بھر اس کا اپنا نظریہ کیا ہے اور اس نے معاشی زندگی کو منظم کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا ہے۔ معاشرہ بغیر معاشی نظام کے بہرحال زندہ نہیں رہ سکتا۔

ایک اشتباہ

اس سوال کے ذیل میں بعض لوگوں کو ایک عظیم اشتباہ یہ پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ علم الاقتصاد اور اقتصادی نظام میں فرق نہیں کر پاتے جس کے نتیجہ میں مختلف غلطیوں میں گرفتار ہوجاتے ہیں اور مسئلہ کی تہہ تک نہیں پہنچ پاتے۔

حل مشکل

ضرورت ہے کہ پہلے علم الاقتصاد اور اقتصادی نظام کے فرق کو واضح کر دیا جائے اس کے بعد قدم آگے بڑھایا جائے تا کہ مستقبل میں کسی اشتباہ کا اندیشہ نہ رہ جائے۔

یہ فرق انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ اقتصادی نظام میں اس طریقہ کار سے بحث کی جاتی ہے کہ جو معاشی زندگی کو عدالت وانصاف کے مطابق منظم کر سکے اور علم الاقتصاد میں کسی طریقہ کار کی ایجاد نہیں ہوتی ۔ بلکہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کے آثار ونتائج کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ جس طرح علم طبیعات میں حرارت کے نتائج وآثار سے بحث کی جاتی ہے ۔ حرارت ایجاد نہیں کی جاتی ۔

دوسرے لفظوں میں علمی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے بحث ہوتی ہے اور علمی دنیا میں جو ہونا چاہیے اسے موضوع بحث بنایا جاتا ہے ۔

مثال

ہم نے اس ذیل میں مختلف مثالوں سے کام لیا ہے اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ لفظوں اور عملی اقتصاد میں کس قدر فرق ہے اور علم الاقتصاد اقتصادی نظام سے الگ ایک چیز ہے ۔ مثال کے طور پر سرمایہ دارنہ نظام اقتصادی زندگی کو آزادی کی بنیاد پر مرتب کرتا ہے اور بازار میں تمام بیچنے والوں کو قیمت کے تعین میں آزاد چھوڑ دیتا ہے ۔ علم الاقتصاد اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ ایجاد نہیں کرتا اور یہ دوکانداروں کی آزادی پر پابندی لگاتا ہے وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ اس آزادی کا اثر کیا ہے ۔ اس میں قیمت کی حرکت اس کا اتار چڑھاؤ اور اس کے تعین وترتیب کس طرح ہوتی ہے ۔

اس کے برخلاف اقتصادی نظام اپنے عدالتی تصورات کی بناء پر طریقہ ایجاد کرتا ہے اور علم اس طریقہ کے نتائج کا مطالعہ کرتا ہے تا کہ سماج پر اس کے اثرات کا جائزہ لیا جا سکے ۔

اسلام نظام ہے

ان مثالوں کی وضاحت کے بعد یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ اسلامی اقتصادیات سے مراد اقتصادی نظام ہے ، علم الاقتصاد نہیں ہے ۔ ہم جس وقت بھی یہ کہتے ہیں کہ اسلام کا دامن اقتصادیات سے خالی نہیں ہے اور اس کے پاس بھی معاشی اصول ہیں تو اس سے مراد

نظام زندگی ہی ہوتا ہے علمی مباحثہ نہیں۔

اسلام ایک مذہب ہے اور مذہب علوم کے بارے میں بحث نہیں کرتا۔ اس کا کام ریاضیات اور فلکیات کے مسائل طے کرنا نہیں ہے اس کا کام زندگی کو مرتب کرنا ہے اور معاشی میدان میں بھی اسلام ایک ایسے طریقہ کو ایجاد کرتا ہے جو انسان کی اقتصادی زندگی کو منظم کر سکے وہ علماء اقتصاد کی طرح نظام سے پیدا ہونے والے آثار اور نتائج کا جائزہ نہیں لیتا۔

جواب کا رُخ

اقتصادیات کے بارے میں مثبت جواب کا صحیح رخ یہ ہے کہ پہلے شریعتِ اسلام کی حقیقت اور اس کی جامعیت و ہمہ گیری کا مطالعہ کیا جائے اور اس پر خود شریعت کے نفوذ قوانین سے استدلال کیا جائے اس کے بعد ان شبہات کا جائزہ لیا جائے جن کا ہدف اسلامی اقتصادیات کو بنایا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ اسلام صرف چند اخلاقی تعلیمات کا نام ہے اس کے پاس معاشی نظام نہیں ہے۔ اسلام ایک وعظ ہے حاکم نہیں ہے۔ اس کا کام اخلاقیات کی تہذیب ہے زندگی کی ترتیب نہیں ہے۔ حالانکہ ایسا کچھ نہیں ہے اسلام بیک وقت وعظ بھی ہے اور مدبر بھی۔ وہ دین ہونے کے ناطے اخلاقیات کا ایک ذخیرہ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور آسمانی قانون ہونے کے رشتے سے زمین کی زندگی کی ترتیب و تنظیم کا قانون بھی اپنے ہمراہ لے کر آیا ہے۔

ذیل میں ہم انہی موضوعات کے تفصیلات کا جائزہ لیں گے اور انہی کی وضاحت کریں گے۔

کیا اسلام میں اقتصادیات ہیں

ہر ذہن ہر زبان پر یہی مسئلہ ہے اور امت کی ہر مشکل میں بھی یہی مسئلہ ابھر کے سامنے آتا ہے کہ کیا اسلام میں اقتصادیات کا وجود ہے اور کیا مذہب نے اقتصادی زندگی کا کوئی حل تلاش کیا ہے؟

دنیا دو عظیم حصوں میں بٹی ہوئی ہے اور کرہ زمین کو دو متضاد نظریات نے گھیر لیا ہے ایک طرف سرمایہ داری کا قبضہ ہے اور دوسری طرف اشتراکیت کا۔ سوال یہ ہے کہ اسلام نے اس مخمصے سے نکلنے کا کوئی راستہ نکالا ہے اور کیا اس کے پاس ان دونوں کا کوئی بدل موجود ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو اس کی قوت اور اس کے امکانات کیا ہیں۔ اور وہ انسانیت کے لئے کتنی پاکیزہ زندگی اور کس قدر مطمئن حیات فراہم کرسکتا ہے؟

یہ مسئلہ صرف معلومات کے اضافہ کا مسئلہ نہیں ہے کہ مسلمان اسلامی اقتصاد کی حقیقت اور اس کے مفہوم کی جستجو صرف ایک فکر لذت کی بناء پر کر رہا ہے۔ نہیں، اس جستجو کا راز یہ ہے کہ مسلمان دونوں متحارب نظریات سے عاجز آچکا ہے اور اس نے دیکھ لیا ہے کہ یہ دونوں تجربات فیل ہو چکے ہیں۔ ان میں زندگی کے معاشی مشکلات کو حل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے اب وہ زندگی کے اس عقائد اور بنیادی خلاء کو پُر کرنا چاہتا ہے جو ان نظاموں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک تحقیق و تفتیش کا راز یہ بھی ہے کہ اب اسلامی فکر نئے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے اور اس کی مختلف شکلیں نظر آنے لگی ہیں۔ اسلام پہلے کی طرح محاذ زندگی پر نا قابلِ توجہ نہیں رہ گیا۔ اب ذہن اس کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں اور ہر شخص حسب استعداد اس سے دلچسپی لینے لگا ہے۔ بعض لوگ اس کے بارے میں معلومات چاہتے ہیں بعض کا نفس اس کی طرف میلان رکھتا ہے اور بعض کی عقل اس کی قیادت و سیادت پر ایمان لائے ہوئے ہے اور اس کا خیال ہے کہ اسلام ہی ان کی زندگی ہے۔

اسلام کے بارے میں چند اندازِ فکر ہیں جنھوں نے اس سوال کو اور بھی اہم اور گھمبیر بنا دیا ہے۔ یہ انداز کبھی سوال بن کر ابھرتے ہیں کبھی جواب کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ اور کبھی اسلام کو عقل کی صالح زمین پر ایمان کا ایک مستحکم قلعہ بنا کر پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ادھر اسلام خود بھی اپنے ماننے والوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ مذہبی تعلیمات یا مذہبی علماء کے سامنے یہ سوال اٹھائیں کہ اسلام نے اشتراکیت اور استعماریت کے مقابلے میں کون سا نظام پیش کیا ہے۔ وہ قرآنِ کریم، ارشاداتِ معصومینؑ اور دیگر وسائل ابلاغ کے

ذریعہ یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ سرمایہ داری اور اشتراکیت سے راضی نہیں ہے اور ان دونوں کو انسانیت کے لئے ہلاکت وتباہی کا سامان سمجھتا ہے پھر یہ کیوں نہیں بتاتا کہ اس سے ہم آہنگ ہو۔ مثبت نظام کے بغیر منفی طریقہ کار اہلِ عقل کی نظر میں قابلِ قبول نہیں ہوتا اور اس کا مفہوم صرف میدانِ حیات سے فرار ہونا ہے اور بس۔

اسلام کا فرض ہے کہ اگر وہ راسمالیت اور اشتراکیت سے اتفاق نہیں رکھتا تو اس کا کوئی بدل پیش کرے۔ اور مسلمانوں کا حق ہے کہ وہ اسلام کے دونوں نظاموں سے ناراضگی کا علم رکھنے کے بعد اُس سے سوال کریں کہ اس نے کون سا بدل ایجاد کیا ہے اور اس کی قوت عمل کیا ہے تاکہ ذاتی طور پر اطمینان بھی پیدا ہو اور اجتماعی طور پر ایک نظام بھی سامنے آئے۔ ہمارے پاس اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اسلام کے تشریعی قوانین تفصیلی احکام اور خطوطِ فکر میں الجھا مواد موجود ہے جس سے ایک مکمل اقتصادی نظام تشکیل پا سکتا ہے جو اقتصادی مذہب سے الگ ہو اور اس کا خاکہ اسلامی اور آسمانی ہو اور انسانیت کے تمام روحانی، مادی، زمانی، مکانی مشکلات کا حل پیش کر سکے۔ جیسا کہ آئندہ تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔

اسلامی اقتصادیات کی نوعیّت؟

اسلام میں اقتصادیات کے وجود کا مطلب کیا ہے؟ اور اس اسلامی اقتصاد کا مزاج کیا ہے جس کی جستجو روزِ ازل سے جاری تھی اور جس کا وجود آخر مرحلہ میں ثابت ہو چکا ہے۔

بحث کا آغاز اس منزل سے ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ جب تک اقتصادیات کی حدود معین نہ ہو جائیں ان کا اثبات ایک بے معنی سی شے ہوگا۔

یاد رکھئے اسلامی اقتصادیات سے مراد اقتصادی نظام اور سسٹم ہے علم الاقتصاد نہیں ہے یعنی ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام کے پاس ایک ایسا نظام اور سسٹم موجود ہے جو اقتصادی زندگی کو عدالت و انصاف کے مطابق مرتب و منظم کر سکتا ہے۔ ہم اسلامی اقتصادیات کی گفتگو میں اسی نظام کے بارے گفتگو کرتے ہیں اور اسی طریقہ کار کو تلاش

کرتے ہیں جس سے معاشی زندگی عدل وانصاف کے تقاضوں کے مطابق ہوجائے۔ ہمارا یہ مقصد ہرگزنہیں ہے کہ اسلام کے پاس کوئی علم الاقتصاد ہے اور وہ دنیا کے دوسرے علوم کی طرح کوئی خالص علمی اور فنی بحث کرتا ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں ہمیں علم اور نظام کا فرق واضح کرنے کے لئے گفتگو کو طول دینا پڑے گا۔ اور یہ واضح کرنا پڑے گا کہ علم اور نظام میں کیا فرق ہے دونوں کا دائرۂ عمل کیا ہے اور کس کے حدود کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں کہ اس کے بغیر بحث کو طول دینا تضیع اوقات ہوگا۔

مثال کے طور پر ہم کسی شخص کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ یہ انجنیئر ہے ڈاکٹر نہیں ہے تو پہلے ہمارا فرض ہے کہ ہم انجنیئر اور ڈاکٹر کے معنی بیان کریں۔ دونوں کے حدود عمل کا تعین کریں۔ دونوں کے علوم کی نوعیت کی وضاحت کریں۔ اس کے بعد یہ ثابت کریں کہ اپنی معلومات کی بناء پر انجنیئر ہوسکتا ہے ڈاکٹر نہیں ہوسکتا۔

اقتصادی مسائل میں بھی صورت حال ایسی ہی ہے۔ ہم نے دعویٰ کیا ہے کہ اسلام اقتصادی نظام ہے اقتصادی علم اور نظریہ نہیں ہے۔

تو ہمارا فرض ہے کہ ہم آثار سے، اشاروں سے، تفصیلات سے یہ واضح کریں کہ علم اور نظام کا فرق کیا ہے تا کہ یہ ثابت کرسکیں کہ اسلام نظام ہے نظریہ نہیں۔ اور یہ مطلب مستقبل میں ہمارے لئے بیحد مفید ہوگا جہاں ہم اسلامی مفکرین کے بیانات کا جائزہ لیں گے اور یہ دیکھیں گے کہ ان حضرات کے انکار کی واحد وجہ یہ ہے کہ انہوں نے علم اور نظام میں فرق نہیں کیا اور علمی قوانین کے نہ ہونے کی بناء پر یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ اسلام کے پاس اقتصادی سسٹم بھی نہیں ہے۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اسلام مذہب ہونے کے اعتبار سے علم الاقتصاد کو موضوع نہیں بناتا لیکن اقتصادی نظام تو بہر حال اس کے لئے ضروری ہے اور یہ دولت اس کے دامن میں موجود ہے۔

علم الاقتصاد اور اقتصادی نظام

انسان اپنی زندگی میں دو طرح کے سوالات سے دو چار ہوتا ہے کبھی اس سے یہ

پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے بیٹے کا انداز حیات کیا ہے اور کبھی یہ سوال ہوتا ہے کہ بیٹے کا سلوک زندگی کیسا ہونا چاہیے۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں سوالات میں زمین وآسمان کا فرق ہے جب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بیٹے کا اندازِ حیات کیسا ہونا چاہیے تو جواب میں وہ تمام مقدس لفظ، خیالات، انداز اور مفاہیم کا تذکرہ کیا جاتا ہے جن کا اپنانا لازمی ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہ میرے بیٹے کو بہادر، جری، غیرت مند، مومن، صالح اور راہِ حق وصداقت میں قربانی دینے والا ہونا چاہیے۔ اور جب یہ سوال ہوتا ہے کہ تمہارے بیٹے کا اندازِ زندگی کیا ہے تو جواب میں افکار و اقدار کے بجائے اطلاعات ومعلومات کا ذخیرہ پیش کیا جاتا ہے کہ وہ آج کل مومن، ثقہ اور بہادر ہے یا اس کا کردار منحرف ہو گیا ہے اور وہ دین کی تجارت کر کے مشکلاتِ حیات سے فرار کرنا چاہتا ہے۔

ظاہر ہے کہ پہلے سوال کا جواب اقدار سے نکالا گیا تھا اور دوسرے سوال کا جواب مشاہدات اور تجربات سے فراہم کیا گیا ہے۔ بعینہٖ یہی فرق اقتصادی نظام اور اقتصادی علم کا ہے۔

اقتصادی علم میں یہ مسائل زیرِ بحث آتے ہیں کہ اقتصادی زندگی کے حالات کیسے چل رہے ہیں اور اقتصادی نظام میں یہ مسئلہ زیرِ غور ہوتا ہے کہ اقتصادی زندگی کو کیسا ہونا چاہیے اور اس کے لئے کن افکار واقدار کو اپنانا چاہیے۔

علم کے سوالات کا جواب مشاہدات اور تجربات سے فراہم کیا جاتا ہے اور نظام کے سوال کا جواب اخلاقی قدروں اور عدالتی اصولوں سے تلاش کیا جاتا ہے جس طرح کے بیٹے کے سلوک کے بارے میں دو طرح کے جوابات دو مختلف مقامات سے فراہم کئے گئے تھے۔

علم الاقتصاد ان تمام حوادث وآثار سے بحث کرتا ہے جو اقتصادی زندگی میں پیش آتے ہیں اور پھر ان کے اسباب وعلل کو تلاش کرتا ہے اور اقتصادی نظام زندگی کی قدریں معین کر کے اس کی اصل حد بندی کرتا ہے کہ اسے عدالت وانصاف کے مطابق کس طرح

ہونا چاہیے اور کن اصولوں کے تحت بسر ہونا چاہیے۔

علم کا نام انکشاف ہے اور نظام کا کام تحدید۔علم جو ہو رہا ہے اس کا تذکرہ کرتا ہے اور نظام جو ہونا چاہیے اس کی حد بندی کرتا ہے۔مثال کے طور پر چند مسائل ملاحظہ ہوں۔

پہلی مثال

علم الاقتصاد اور اقتصادی نظام کا فرق واضح کرنے کے لئے سب سے پہلے بازار میں قیمت اور ڈیمانڈ کے رابطہ کا مسئلہ اٹھایا جاتا ہے۔دنیا میں کون سا انسان نہیں جانتا کہ جب ڈیمانڈ زیادہ ہوتی ہے تو قیمت خود بخود بڑھ جاتی ہے۔ایک ہی کتاب عام حالات میں دو روپیہ کی ہوتی ہے اور جب اسکول کے نصاب میں شامل ہو جاتی ہے اور طلبہ اس کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں تو دس روپیہ کی ہو جاتی ہے۔یہی حال ہر جنس کا ہے کہ جس قدر طلب زیادہ ہوگی اسی قدر قیمت میں اضافہ ہوگا۔یہ ایک محسوس مشاہدہ ہے جسے ہر شخص نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔اب یہی مسئلہ علم الاقتصاد اور اقتصادی نظام کے حوالے کیا جاتا ہے۔ دونوں اس پر دو رُخ سے بحث کرتے ہیں۔

علم الاقتصاد یہ کہتا ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے جو ہر آزاد بازار میں پیش آتی ہے اور اس کا سبب بڑی طاقتوں یعنی حکومت کی طرف سے قیمتوں کے معاملے میں مداخلت نہ کرنا ہے۔ورنہ اس زیادتی کا کوئی امکان نہیں تھا اس کے بعد یہ دیکھتا ہے کہ کیا طلب کے اضافہ کی نسبت سے قیمت بھی بڑھتی رہتی ہے یا قیمت ایک مقام پر ٹھہر جاتی ہے۔اور پھر یہ کام بھی تمام اجناس میں ہوتا ہے یا بعض اجناس میں طلب کی زیادتی سے قیمت میں زیادتی اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔اور بعض میں کم کہ ان کی قیمت پر ڈیمانڈ کا اضافہ اس مقدار میں اثر انداز نہیں ہوتا۔انہیں حقائق کی روشنی میں علم الاقتصاد طلب اور قیمت کے تناسب کا جائزہ لیتا ہے اور آزاد بازار کے حالات کا تجزیہ کرتا ہے۔وہ اپنی طرف سے حالات میں کسی طرح کا تغیر نہیں کرتا صرف حالات کو دیکھ کر انہی کی روشنی میں علمی قوانین وضع کرتا ہے اور اس کے ارتباط پر مکمل طور پر توجہ دیتا ہے۔

اقتصادی نظام کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ آزاد بازار کے حالات اور آزادی کی قیمتوں پر اثر انداز ہونے اور طلب و قیمت کے تناسب پر بحث نہیں کرتا اور نہ یہ دیکھتا ہے کہ بازار کی حریت کی قدر و قیمت کیا ہے اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کی اہمیت کیا ہے اور قیمت کا طلب سے مربوط ہو جانا بازار کو کس منزل تک پہنچا دیتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس آزادی کا اثر اجتماعی عدالت پر کیا پڑتا ہے اور اس سے انصاف کہاں تک باقی رہ سکتا ہے۔

اقتصادی نظاموں میں ہر نظام کا کام یہی ہے کہ وہ اپنے مخصوص تصور عدالت کی روشنی میں اس بات کا جائزہ لے کہ فلاں طریقہ کار کس حد تک عدالت کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے اور کہاں سے عدالت سے الگ ہو جاتا ہے۔

آزاد بازار کے بارے میں بھی اس کی بحث صورتحال کے علمی قوانین اور اسباب سے متعلق نہیں ہے۔ نہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ قیمت کا تعلق طلب سے کیوں ہے اور دونوں میں ایک ساتھ اضافہ کیوں ہوتا ہے۔ یہ کام علم الاقتصاد کا ہے۔ نظام صرف یہ دیکھتا ہے کہ کیا بازار کو ایسا ہی آزاد رہنا چاہیے۔ اور کیا یہ آزادی اجناس کی عادلانہ تقسیم کر سکتی ہے اور سماج کی تمام ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے۔ اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ سماجی حالات کا تجزیہ کر کے قیمت اور طلب کے تناسب پر بحث کرے گا۔ اور رسد وطلب کے قوانین وضع کرے گا ایک بے معنی سی بات ہے۔ یہ کام علم الاقتصاد کا ہے، اقتصادی نظام کا نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آزاد بازار میں کیا حالات رونما ہوتے ہیں۔ ان کے کیا اسباب ہوتے ہیں اور ان سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ یہ تحقیق علم الاقتصاد کا موضوع ہے۔ اور کیا بازار کو آزاد رکھنا چاہیے اور آزادی سے اجتماعی عدالت کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے یہ اقتصادی نظام کا موضوع ہے۔ اور دونوں دو الگ الگ چیزیں ہیں جن کے موضوعات بھی الگ ہیں اور انداز بحث بھی الگ۔

دوسری مثال

ریکارڈ رو کا خیال ہے کہ اگر مزدور کی اجرت آزاد ہو گی اور اس کا حکومت کی طرف سے کوئی تعین نہ ہوگا تو اس کی مقدار ادنیٰ معیشت سے زیادہ نہیں ہوسکتی اور اگر کبھی اتفاقاً زیادہ ہوگئی تو ایک دم پلٹ کر پھر ادنیٰ درجہ پر آجائے گی۔

اس کی تفسیر اس لئے بیان کی ہے کہ جب اجرت ادنیٰ درجے سے زیادہ ہوگی تو سارے مزدور کام کرنے کی طرف مائل ہو جائیں گے اور خوش حالی کی بناء پر ان کے درمیان شادی بیاہ اور اولاد کا بھی سلسلہ شروع ہوجائے گا اور چند دنوں کے بعد مزدوروں کی تعداد بڑھ جائے گی۔ اور یہ ہر آزاد بازار کا قاعدہ ہے کہ جس قدر مال زیادہ ہوگا اسی قدر قیمت کم ہوگی نتیجہ میں ایک دن قیمت پلٹ کر پھر ادنیٰ درجہ پر آجائے گی اور اضافہ صرف عارضی ہوگا جس طرح کہ ادنیٰ درجہ سے گھٹ جانا بھی عارضی ہی ہوگا اور مزدور مرنے لگیں گے اور ان کی موت سے تعداد گھٹ جائے گی اور تعداد کی کمی ان کی قیمت بڑھادے گی اور اس طرح اجرت پلٹ کر پھر ادنیٰ درجے پر آجائے گی۔

مختصر یہ کہ ریکارڈ رو آزاد بازار کا جائزہ لے کر یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ علمی اعتبار سے ایسے بازار میں اجرت کا معیار کم سے کم رہے گا کہ اس سے اضافہ مزدوروں کو بڑھا کر قیمت کو گھٹا دے گا۔ اور اس سے کمی مزدوروں کو بڑھا کر قیمت کو گھٹا دے گا اور اس سے کمی مزدوروں کی موت کی سبب بن کر قیمت میں اضافہ کردے گی۔

ریکارڈ رو کا یہ فلسفہ اس صورتحال کے تجزیے کا جواب ہے اور اس مسئلے کو طے کرتا ہے کہ اگر بازار آزاد رہتا ہے تو قیمتوں کا انداز کیا ہوتا ہے۔ اس کو اس بات سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ یہ آزادی، اجتماعی عدالت کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے یا نہیں اور اس سے معاشرہ میں رہنا چاہیے یا نہیں۔

اس کے برخلاف اقتصادی نظام ایسے طریقے ایجاد کرنا چاہتا ہے جس سے بازار کی تنظیم عدالتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہوجائے اور وہ یہ دیکھتا ہے کہ آزادی ان تقاضوں کو پورا کرسکتی ہے یا نہیں اور آزادی کی فضا میں مزدوروں کو ان کا جائز حق مل سکتا ہے یا نہیں؟

نظام کا کام عدالتی نقطہ نظر سے بازار کو منظم کرنا اور اس کی بنیادوں کو تلاش کرنا ہے۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ یہ کام آزادی سے ہوسکتا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہوسکتا تو دوسرا سسٹم تلاش کیا جائے اور اس کی بنیاد پر بازار کی تنظیم کی جائے۔

صورتحال اور اس کے نتائج کا تجزیہ علم کا کام ہے اور صورتِ حال کو باقی رکھا جائے یا غیر منصفانہ قرار دے کر بدل دیا جائے یہ نظام کا کام ہے وہ انکشافی عمل ہے اور انقلابی اقدام۔

تیسری مثال

اس مثال میں پیداوار کو موضوع بنا کر یہ دیکھا جاتا ہے کہ پیداوار کب علم الاقتصاد کا موضوع بنتی ہے اور کب اقتصادی نظام کے زیرِ اثر آجاتی ہے۔ جس طرح کہ گذشتہ مثال میں اجرت کو موضوع گفتگو بنایا گیا تھا۔ پیداوار کے بارے میں علم الاقتصاد ان وسائل واسباب سے بحث کرتا ہے جن سے پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً دوطرح کے طریقوں کا جائزہ لے کر دیکھتا ہے کہ کس صورت میں پیداوار زیادہ ہوتی ہے وہ ایسا کارخانہ دیکھتا ہے جس میں دس مزدور کام کرتے رہتے ہیں اور ہر مزدور کو ایک مکمل گھڑی بنانے کا کام سپرد کردیا جاتا ہے اور ایک ایسے کارخانہ کا جائزہ لیتا ہے جس میں دس مزدور کام کرتے ہیں اور ہر مزدور کو گھڑی کے ایک پرزے کا کام کام سپرد کیا گیا ہے جس کے مجموعے سے ایک گھڑی تیار ہوتی ہے۔ اور پھر یہ دیکھتا ہے کہ پہلی صورت میں اتنے ہی وقت میں کتنی گھڑیاں تیار ہوتی ہیں جتنی دیر میں دوسری صورت میں تیار ہوتی ہیں اور اس کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ علمی اعتبار سے "تقسیم کار" کا قانون کار سے زیادہ مفید ہے۔

جس طرح کہ پیداوار کے سلسلے میں علم الاقتصاد میں غلہ کی کمی کا قانون بھی زیرِ بحث آتا ہے اور اس میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ زراعتی پیداوار میں زمین پر اخراجات کا بڑھا دینا غلہ کے اضافے کا سبب نہیں ہوتے اور نہ یہ ممکن ہے کہ زمین پر سو کے دوسو خرچ کر دیئے جائیں تو پیداوار بھی ایک من کے بجائے دومن ہوجائے اور اس طرح اضافہ ہوتا

رہے اس لئے کہ زمین کی صلاحیت محدود ہے اور وہ اخراجات کے ساتھ اپنی صلاحیت میں اضافہ نہیں کرسکتی۔ اس طرح علم الاقتصاد حقائق کا انکشاف کر کے اسباب وعوامل کی تلاش کرتا ہے اوران کے صورتحال پر اثر انداز ہونے سے بحث کرتا ہے۔

اس کے برخلاف اقتصادی نظام کا معاملہ الگ ہے۔ اس کے موضوعات درج ذیل ہیں:

پیداوار کو آزاد رہنا چاہیے یا اس پر حکومت کی طرف سے کوئی پابندی عائد ہونی چاہیے؟

پیداواری کے اضافہ کو بنیادی مقصد قرار پانا چاہیے یا اس کی حیثیت صرف ایک وسیلہ کی ہونی چاہیے اور مقصد کو اس سے بلند تر ہونا چاہیے تو اس کی وجہ سے وسیلہ پر کیا پابندیاں عائد ہونی چاہییں۔

اس کے بعد پیداوار کو تقسیم کی بنیاد پر بنانا چاہیے یا برعکس یعنی پیداوار کا قانون تقسیم کی روشنی میں مرتب ہونا چاہیے کہ جس قدر بھی پیداوار زیادہ ہو اس اعتبار سے تقسیم کر دی جائے۔ مثال کے طور پر اگر پیداوار کو ضرورت پڑ گئی کہ لوگوں سے اموال حاصل کرے اور یہ کام سود کے بغیر ممکن نہیں ہے تو اسے اختیار ہے کہ سود کا قانون وضع کر کے اموال حاصل کر لے اوران اموال کے ذریعہ پیداوار میں اضافہ کرے اور پھر جس قدر مال پیدا ہو اسے تقسیم کر دے یا پیداوار کو بھی تقسیم کا پابند ہونا چاہیے کہ پہلے یہ دیکھا جائے کہ تقسیم میں عدالت کے تقاضے کیا ہیں۔ اس کے بعد اسی اعتبار سے پیداوار پر توجہ دی جائے اور اسے بھی عدالتی تقاضوں کے مطابق محدود کر دیا جاتا ہے۔

یہ تمام وسائل اقتصادی نظام کے ہیں۔ اس کا کوئی تعلق علم الاقتصاد سے نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ علم اور نظام کی راہیں الگ الگ ہیں۔ علم صورتحال کا جائزہ لے کر اس کے اسباب وعلل سے بحث کرتا ہے اور نظام صورتحال کو عدالت کے پیمانے پر

ناپنا تولنا چاہتا ہے۔علم کا کام انکشاف کرنا ہے اور نظام کا کام تغیر وانقلاب پیدا کرنا۔علم ایک چشمہ ہے جس کو لگا کر صورتحال کا جائزہ لیا جاتا ہے اور اس میں کوئی اضافہ وتغیر نہیں ہوتا۔اور نظام ایک قانون ہے جس کا کام صورتحال کی اصلاح کرنا ہے اور اسے عدالت کے تقاضوں کے مطابق بنا دینا ہے۔

علم کا اعلان ہے کہ سماج میں کیا ہو رہا ہے اور مذہب کا نعرہ ہے کہ سماج میں کیا ہونا چاہیے۔

علم ومذہب اور تاریخ واخلاق

علم ونظام کے حالات کا مزید جائزہ لیا جائے تو دونوں میں تاریخ اور اخلاق حسب رشتہ نظر آتا ہے۔علم کا کام تاریخ جیسا ہے اور نظام کا کام اخلاق جیسا، اور دنیا کا کون سا انسان ہے جو علم تاریخ اور علم اخلاق کا فرق نہیں جانتا کہ علم تاریخ نے صرف صورت حال کا جائزہ لینا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ درانی حکومت کے زوال کے اسباب کیا ہیں اور صلیبی جنگوں میں فلسطین پر حملہ کے کیا عوامل تھے اور وہ حملے کیوں ناکام ہو گئے۔قیصر کی حکومت کے سقوط کے حالات کیا تھے۔اس سے زیادہ تاریخ کا کام نہیں ہے وہ حالات کا مشاہدہ کرتی ہے، اسباب کی جستجو کرتی ہے اور نتائج کا جائزہ لیتی ہے۔اس کام اسباب وروابط و نتائج کا انکشاف کرتا ہے اور بس۔اخلاقی اعتبار سے ان کی قیمت لگانا نہیں ہے۔اسے یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ قیصر کی ہلاکت صحیح تھی یا غلط۔اسے یہ بتانے کا اختیار نہیں ہے کہ صلیبی حملے عادلانہ تھے یا ظالمانہ۔ رومان پر بربریوں کا ہجوم مطابق انصاف تھا یا خلاف انصاف۔یہ سب باتیں اخلاقیات سے وابستہ ہیں۔ان کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

تاریخ حادثہ کو بیان کرتی ہے اور علم الاخلاق اس کی قدریں معین کرتا ہے۔اس طرح علم الاقتصاد اقتصادی حالات کا تجزیہ کرتا ہے اور اقتصادی مذہب ان کی قدر وقیمت کا حساب لگاتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ یہ حالات اجتماعی عدالت کے مطابق ہیں یا نہیں؟

علم الاقتصاد اور دوسرے علوم

یہ بات فقط علم الاقتصاد کے ساتھ نہیں ہے بلکہ دنیا کے ہر علم کا انکشاف کرنا ہے اور بس۔ قدر و قیمت کا تعین کرنا کسی علم کے دائرۂ عمل میں داخل نہیں ہے۔ یہی کام علم الاقتصاد کا ہے اور یہی کام فزکس، فلکیات اور علم النفس کا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ علم الاقتصاد و اقتصادی حالات کا جائزہ لیتا ہے اور دوسرے علوم دوسرے قسم کے حالات کا۔

فزکس کا عالم روشنی اور آواز کی مختلف حرکتوں کا جائزہ لیتا ہے اور ان کے تناسب کا پتہ لگا تا ہے۔ ایٹم کا عالم ذرہ کی ترکیب اور اس کی موجوں کا جائزہ لے کر اس کے اندر کام کرنے والے قوانین کا انکشاف کرتا ہے۔ فلکیات کا عالم آسمان کے اجرام فلکی کا مطالعہ کرتا ہے اور ان کے قوانین کا پتہ لگا تا ہے۔

نفسیات کا عالم مثلاً ایک حاسہ بصارت کا جائزہ لیتا ہے اور اس کے نفسیاتی عوامل کا انکشاف کرتا ہے۔

اسی طرح علم الاقتصاد کا ماہر اقتصادی حالات کا تجزیہ کرتا ہے چاہے وہ حالات طبعی ہوں۔ جس طرح کہ اخراجات کے اضافہ کے باوجود غلہ کی پیداوار کا کم ہونا۔ یا اجتماعی ہوں جس طرح کہ آزاد بازار میں ڈیمانڈ کی کمی یا زیادتی کا قیمت پر اثر انداز ہونا۔ حالات کی اخلاقی قدر و قیمت کا تعین کرنا اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔

فرق مقصد کا ہے موضوع کا نہیں

مذکورہ بالا بیانات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ علم اور نظام کا فرق بحث کے مقاصد سے متعلق ہے موضوعات سے نہیں اور اس طرح وہ تمام لوگ غلطی پر ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ دونوں کا فرق موضوعات سے متعلق ہے کہ علم کا موضوع اور ہے اور نظام کا موضوع اور۔ علم الاقتصاد پیداوار اور اس کے اسباب وعوامل سے بحث کرتا ہے اور اقتصادی نظام تقسیم اور اس کے احکام سے بحث کرتا ہے اور ان روابط کا جائزہ لیتا جو اس نظامِ تقسیم کی بنا پر عالم وجود

میں آتے ہیں۔ اس لئے کہ ہم پہلے یہ واضح کر چکے ہیں کہ پیداوار اور تقسیم دونوں علم کے موضوعات بھی ہیں اور نظام کے موضوعات بھی۔ محدود اجرت کا قانون تقسیم سے متعلق ہے لیکن علم الاقتصاد سے بھی متعلق ہے۔ پیداوار کا آزاد رہنا یا حکومت کے زیر اثر رہنا مذہب و نظام کا موضوع ہے لیکن پیداوار سے متعلق ہے اس طرح یہ سوچنا کہ مسئلہ پیداوار سے متعلق ہے تو علمی ہے اور تقسیم سے متعلق ہو تو عملی اور نظامی ایک واضح غلطی ہے اصل فرق مقصد کا ہے کہ گفتگو موجودہ صورتحال سے ہو تو بحث علمی ہے اور مناسب صورتحال سے ہو تو بحث علمی اور نظامی۔ اس سے زیادہ اس امر کی وضاحت نہیں کی جاسکتی۔

علم مذہب کے دائرہ میں

یہ صحیح ہے کہ علم الاقتصاد جس طرح پیداوار کے بارے میں بحث کر کے غلہ کی کمی کے قانون کا انکشاف کرتا ہے اسی طرح تقسیم کے بارے میں بحث کر کے یہ طے کرتا ہے کہ آزاد معاشرے میں اجرت کی مقدار ''بقدر کفایت مال'' سے زیادہ نہیں ہوسکتی اور جب کبھی عارضی طور پر کم یا زیادہ ہوگی تو مزدوروں کے اضافہ یا موت کے سبب اصلی صورت حال پر پلٹ آئے گی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ علم الاقتصاد کے بعض مسائل مذہب و نظام کے زیر اثر انجام پاتے ہیں۔ علم کا پیداوار کے بارے میں بحث کرنا دوسرے انداز سے ہے اور تقسیم کے بارے میں بحث کرنا دوسرے انداز سے۔ وہ پیداوار کے بارے میں غلہ کی کمی کا قانون طے کرتا ہے تو اس کا اطلاق دنیا کی ہر زمین اور ہر معاشرہ پر ہوتا ہے اور تقسیم کے مرحلہ پر اجرت کا قانون طے کرتا ہے تو اس کا اطلاق صرف افراد معاشرے پر ہوتا ہے ورنہ حکومت کی طرف سے اجرت کے معاملات میں مداخلت کر دی جائے تو یہ علمی قانون اپنی زمین ہی کھو بیٹھے گا۔ اور بے معنی ہو کر رہ جائے گا جس کا مطلب یہ ہے کہ علم الاقتصاد کے پیداوار کی مباحث تعلیمی مباحث سے مختلف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کو دھوکہ ہو گیا ہے کہ تقسیم نظام کا موضوع ہے علم کا نہیں۔ حالانکہ انہیں یہ سوچنا چاہیے کہ اجرت کے قانون کا موضوع خالص علمی ہے اگرچہ اس کا پلیٹ فارم مذہبی ہے اور پلیٹ فارم کا مذہبی ہونا بحث

کو علمی ہونے سے نہیں نکال سکتا۔ علمی بحث بہر حال علمی رہے گی چاہے اس کا دائرہ عملی کتنا ہی مذہبی اور نظامی کیوں نہ ہو۔

نتائج بحث

گذشتہ تمام بحثوں سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

۱۔ علم الاقتصاد اور اقتصادی نظام کا فرق ان کے بنیادی مقاصد میں پوشیدہ ہے۔ علم کا مقصد اقتصادی زندگی اور اس کے ظواہر کا انکشاف کرنا ہے اور نظام کا مقصد اقتصادی زندگی کو عدالت کے تقاضوں کے مطابق منظم کرنا ہے۔ علم حقیقت کو واضح کرنے کا عمل انجام دیتا ہے اور نظام عدالت کو مجسم کرنے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔

۲۔ علم الاقتصاد اور اقتصادی نظام دونوں کا دائرہ عمل اس قدر وسیع ہے کہ اس میں پیداوار اور تقسیم دونوں کے مباحث شامل ہوتے ہیں۔ موضوعات کی بناء پر دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف صرف مقاصد کے اعتبار سے ہے۔

۳۔ علم الاقتصاد کے قوانین پیداوار کے میدان میں ہر سماج اور ہر معاشرے کے کام آتے ہیں چاہے وہاں کا اقتصادی نظام کیسا ہی کیوں نہ ہو لیکن تقسیم میدان میں اس کے قوانین کسی نہ کسی مخصوص نظام کے تحت کام آتے ہیں۔ نظام سے الگ ہو جانے کے بعد اس کے قوانین تقسیم کے میدان میں بیکار ہو جاتے ہیں۔

نظام علمی وسائل کو استعمال نہیں کرتا

یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ اقتصادی نظام عدالت کے تقاضوں کی تعبیر کرتا ہے۔ اسے زندگی کے اقتصادی حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کا انکشاف کرنا علم الاقتصاد کا کام ہے اور اس سے یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ دونوں کے وسائل بحث بھی الگ الگ ہیں۔ علم زندگی کے معاشی حقائق کے انکشاف میں علمی وسائل یعنی مشاہدہ و تجربہ کو استعمال کر سکتا ہے اور ان کے ذریعہ اقتصادی حقائق و وقائع کی تشریح کر سکتا ہے کہ اگر کسی قضیہ کے بارے میں

شبہ پیدا ہو جائے تو وہ مسلسل حادثات کا مطالعہ کر کے یہ طے کر سکتا ہے کہ یہ واقعہ صحیح ہے یا نہیں۔ اوران دونوں باتوں میں واقعی ارتباط ہے یا نہیں۔ جس طرح کہ طبیعات کا عالم جب یہ تحقیق کرنا چاہتا ہے کہ پانی حرارت کے کس درجہ پر جوش میں آجاتا ہے تو اس کے لئے عین ممکن ہے کہ پانی کو سامنے رکھ کر یہ دیکھتا رہے کہ وہ حرارت کی کس منزل پر ابلنے لگتا ہے۔ خود اقتصادیات کے عالم کا بھی یہی حال ہے کہ وہ جب یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ سرمایہ دار معاشرہ میں اقتصادی مشکلات کب پلٹ کر آتے ہیں تو پہلے اقتصادی زندگی مسلسل حادثات کا جائزہ لیتا ہے اور وہ حادثہ مقاصد کو دیکھتا ہے اور جب اس فاصلہ کو یکساں پاتا ہے تو یہ طے کر لیتا ہے کہ حادثہ اتنے دنوں کے بعد پلٹ کر آجاتا ہے پھر اس کے بعد اس کے اسباب وعوامل کی جستجو میں لگ جاتا ہے۔ برخلاف اس کے اقتصادی نظام کا کام یہ نہیں ہے۔ وہ موضوعات کے مطالعات عدالت کے نقطۂ نگاہ سے کرتا ہے اور عدالت ہی کے مطابق ایک طریقہ حیات ایجاد کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عدالت کا معاملہ پانی کے جوش کھانے اور اقتصادی حوادث کے پلٹ کر آنے سے بالکل مختلف ہے یہ کوئی عالمی واقعہ یا کائناتی حادثہ نہیں ہے کہ اس کا مشاہدہ وتجربہ کیا جا سکے اور نہ یہ ممکن ہے کہ حالات وواقعات کو دیکھ کر یہ طے کر لیا جائے کہ اس میں عدالت کیا ہے اور ظلم کیا ہے۔ اس کام کے لئے الگ سے معیار و میزان طے کرنا ہوگا اور اس کی روشنی میں مسائل کا فیصلہ کرنا ہوگا۔ مثال کے طور پر منزل تقسیم میں عدالت کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تقسیم میں عدالت کے معنی تمام افراد معاشرہ کو برابر برابر مال تقسیم کر دینا ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ عدالت کے معنی مال کے بجائے آزادی میں مساوات قائم کرنا ہے چاہے اس آزادی کے استعمال میں مالیات کے اعتبار سے درجات ہی کیوں نہ قائم ہو جائیں بشرطیکہ آزادی کا مرتبہ برابر رہے۔

تیسری جماعت کا عقیدہ ہے کہ عدالت کے معنی ایک مخصوص معیار زندگی کی ضمانت دے دینے کے بعد حریت میں مساوات قائم کرنے کے ہیں کہ اصل زندگی کا سامان سب کے لئے مہیا رہے اور اس کے بعد اضافہ میں سب کو اختیار رہے جو اسلام کا نقطۂ نظر ہے۔

اب اگر ہمیں یہ تحقیق کرنا ہے کہ عدالت کا واقعی طریقہ رزق میں مساوات یا حریت میں مساوات یا ایک تیسرے انداز فکر کو اس کے لئے علمی وسائل کا استعمال کرنا ناممکن ہے۔عدالت کوئی حادثہ اور واقعہ نہیں ہے کہ اس کو اعضا و جوارح سے دیکھ لیا جائے اور نہ ایسا اجتماعی مظہر ہے کہ اس کا تجربہ کر لیا جائے۔علم لوگوں کا حساب کر سکتا ہے ان کے جسمانی اور نفسیاتی اوصاف کے فرق کا اندازہ کر سکتا ہے لیکن ان کا رزق میں کتنا حق ہے اور انہیں کس قدر ثروت ملنی چاہیے۔سب کے برابر یا کم وبیش اس کا تجزیہ نہیں کر سکتا۔عدالت و حق کے مسائل خارجی واقعات نہیں ہیں کہ ان کو علمی معیار پر یہ پرکھ لیا جائے اور حواس ظاہری سے محسوس کر لیا جائے۔

مثال کے طور پر ایک سرمایہ دار انسان کا عقیدہ یہ ہے کہ لوگ حق آزادی میں مساوات رکھتے ہیں چاہے ان کے رزق میں کسی قدر فرق کیوں نہ ہو اور ایک اشتراکی انسان کا نظریہ ہے کہ لوگ حق رزق میں مساوات کے مالک ہیں تو کیا ان میں سے کسی کے پاس ایسا تھرمامیٹر ہے جس کے ذریعہ یہ حساب لگایا جا سکے کہ رزق کی مساوات والے معاشرہ میں عدالت زیادہ ہے یا حریت کی مساوات والے معاشرہ میں۔اور کیا حق بھی کوئی محسوس واقعہ ہے جس کا اندازہ حواس ظاہری سے انسانوں کے قدو قامت اور رنگ وروپ کی طرح کر لیا جائے! ہرگز نہیں۔تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عدالت کوئی تھرمامیٹر نہیں ہے اور اس کا ادراک احساس اور مشاہدہ سے ممکن نہیں ہے۔حق کوئی قابل احساس واقعہ نہیں ہے کہ اس کے بارے میں علم اور تجربہ کو حکم بنایا جا سکے اور اس کے ذریعہ کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔حق و عدالت کا معاملہ کسی بھی نظام کی عدالت کے بارے میں ذاتی تصورات،اس کی قدر و قیمت اور زندگی کے بارے میں اس کے عمومی تصورات سے وابستہ ہے۔ جو نظام جس شے کو عدالت تصور کرتا ہے اور جس قدر عدالت کو اہمت دیتا ہے اور زندگی کے عمومی تصورات کی روشنی میں جو عدالت کے مفہوم معین کرتا ہے اس کے اعتبار سے معاشرہ کی تنظیم کرے گا اور حیات کے قوانین وضع کرے گا۔

اسلامی اقتصادیات کا صحیح تصور

گذشتہ بحثوں میں علم الاقتصاد اور اقتصادی نظام کے فرق کے ساتھ دونوں کے حدود اور مفاہیم کا تعین ہو چکا ہے اور اب اس سلسلے میں مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ اب ہم اس مرحلہ میں آچکے ہیں جہاں سے یہ واضح کیا جائیگا کہ اسلامی اقتصادیات کا مفہوم کیا ہے اور اس کے وجود کے شواہد کیا ہیں۔

یہ بات گو بہر حال واضح ہے کہ اسلامی اقتصادیات سے مراد اقتصادی نظام اور سسٹم ہے علم الاقتصاد نہیں ہے۔ ہمارا یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ اسلام اقتصادی زندگی کے حوادث وقائع کی تشریح وتفسیر کے لئے آیا تھا اور اس کا منصب یہ تھا کہ اقتصادی نشیب وفراز کے اسباب وعوامل تلاش کرے جس طرح کہ اس کا کام طبیعات یا فلکیات کے مسائل طے کرنا نہیں تھا۔ وہ ایک مذہب اور طریقہ حیات تھا۔ اس کا فرض منصبی تھا کہ معاشیات کے لئے ایک ایسا نظام پیش کرے جو رائج الوقت نظاموں سے الگ اور عدل وانصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہو۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور عدالت کے تصورات کے مطابق ایک نظام پیش کیا جسے اسلام کا اقتصادی نظام یا مذہب کہا جاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ اسلام معاشی حالات کا جائزہ لینے کے لئے آیا ہوگا اور اس کا موضوع بحث یہ ہوگا کہ حجازی معاشرے میں سود کی شرح کیوں بڑھتی جا رہی ہے تو وہ ایک اقتصادی علم ہوگا اور اس کا شمار علوم کی فہرست میں ہوگا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ خود سودی فائدہ کی حیثیت پر نظر ڈالی اور اسے حرام کر دیا۔ اور سرمایہ وصاحب کارخانہ کے مسائل کو مضاربہ کے عنوان پر طے کرا دیا۔ جس سے سود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ شرح احداث اور تشریح حوادث کے لئے نہیں آیا تھا بلکہ تغیر اقدار اور تنظیم حیات کے لئے آیا تھا۔

اس وضاحت کے بعد ان تمام اعتراضات پر قابو پانا آسان ہے جو اسلامی اقتصادیات کی راہ میں دیوار بنا کر کھڑے کئے جاتے ہیں۔

بنیادِ اعتراض

اسلامی اقتصادیات پر اعتراض کی سب سے بڑی بنیاد یہی ہے کہ معترضین نے علم اور مذہب کے فرق کو محسوس نہیں کیا اور اسلامی روایات میں علمی مسائل کو نہ پا کر یہ طے کر دیا کہ اسلام میں اقتصادیات کا وجود نہیں ہے حالانکہ انہیں قدرے دقت نظر سے کام لینا چاہیے تھا اور یہ دیکھنا چاہیے تھا کہ اسلامی اقتصادیات سے مراد کیا ہے۔ صرف یہ دیکھ کر اسلام میں علما اقتصادیات، آدم اسمتھ، ریکارڈ رو وغیرہ جیسے حضرات کی بحثوں کا ذکر نہیں ہے وہاں ''غلہ کی کمی''، ''رسد وطلب''، ''اجرت کا آہنی قانون'' جیسے مسائل نہیں پائے جاتے۔ قیمت کا تجزیہ نہیں کیا گیا۔ یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ اسلام میں اقتصادیات کا وجود نہیں ہے اور یہ دلیل قائم کی کہ ایسے اہم مسائل کے نہ ہوتے ہوئے اقتصادیات کا اعتراف کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ یہ مسائل آخری چار صدیوں کے اندر کے مسائل ہیں اور اسلام میں ان مسائل کے اٹھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ایک اقتصادی نظام ہے جس میں عدالت کے تقاضوں کے مطابق زندگی کو منظم کیا جاتا ہے۔ ہمارا دعویٰ علم الاقتصاد کے وجود سے متعلق نہیں ہے کہ اس میں آدم اسمتھ جیسی بحثیں تلاش کی جائیں۔ ہمارا دعویٰ اقتصادی نظام سے متعلق ہے جس کا وجود ایک امر معقول اور شے ممکن ہے اس سے زیادہ تفصیلات کا موقع نہیں ہے اور نہ ہم اس مقام پر قرآن وسنت سے اقتصادی نظام کے وجود پر دلائل فراہم کرنے کے موقف میں ہیں۔ یہ کام ہم نے آئندہ رسالوں کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ اس رسالہ میں تو صرف اقتصادی نظام کے وجود کا دعویٰ کرنا تھا اور اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا مقصود تھا کہ علم اور مذہب کی راہیں الگ الگ ہیں اور ایک کے مباحث کا نہ ہونا دوسرے کے مسائل کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ ویسے خود شریعت اسلام کی ساخت اور اس کا مزاج بھی اسلامی اقتصادیات کے وجود کی بہترین دلیل ہے جس سے کسی وقت بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

شریعت کی ہمہ گیری

شریعتِ اسلام کا زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہونا اور جملہ مسائل حیات کے لئے جامع و ہمہ گیر ہونا ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کے اثبات کے لئے تمام روایات کا جائزہ لینا پڑے اور جملہ احکام کے تفاصیل پر غور کرنا پڑے یہ بات خود شریعت کے مزاج کے اندر ہے اور روایات میں جہاں جہاں شریعت کے مزاج کا ذکر کیا گیا ہے اس میں اس ہمہ گیری کا ذکر موجود ہے۔ مثال کے طور پر چند روایات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ ابو بصیر بیان کرتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے شریعتِ اسلام کی جامعیت و ہمہ گیری اور آئمہ اہلِ بیتؑ کے علوم کی وسعت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس شریعت میں جو حلال و حرام اور ہر وہ شے جس کا انسان محتاج ہوسکتا ہے موجود ہے۔ یہاں تک کہ خواہش لگ جانے تک کا قانون موجود ہے۔

یہ کہہ کر آپ نے ابوبصیر کے جسم کو اپنے ہاتھوں سے دباتے ہوئے فرمایا کہ اس کا تاوان بھی شریعت میں موجود ہے اور جسم پر زور دینے سے پہلے ابوبصیر سے اجازت لی کہ شرعاً ایسا اقدام صحیح نہیں ہے۔ ابوبصیر نے بھی عرض کیا کہ میں آپ کا غلام ہوں آپ کو ہر اختیار حاصل ہے۔

۲۔ دوسرے مقام پر امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ شریعت میں ہر وہ شے موجود ہے جس کے لوگ محتاج ہو سکتے ہیں۔ دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا حل اسلام میں نہ ہو یہاں تک کہ خواہش کے تاوان کا بھی ذکر موجود ہے۔

۳۔ نہج البلاغہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن حکیم کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں

اللہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس وقت بھیجا جب رسولوں کا سلسلہ رُکا ہوا تھا اور امتیں خواب غفلت میں تھیں۔ محکم پیانے

توڑے جا رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آکر وہ کتاب پیش کی جو سابق کتابوں کی مصدق تھی اور قابل اقتدار نور کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہی کتاب قرآن ہے اس کو دعوت سخن دو۔ اگر چہ یہ تم سے کلام نہ کرے گا۔لیکن میں تمہیں خبر دیتا ہوں کہ اس میں مستقبل کے مسائل اور ماضی کے واقعات سب موجود ہیں۔ یہ تمہارے امراض کی دوا اور تمہارے معاشرہ کی تنظیم کا وسیلہ ہے۔

ان بیانات سے صاف واضح ہوجاتا ہے کہ اسلامی شریعت ایک جامع اور ہمہ گیر شریعت ہے اور اس میں چھوٹے سے چھوٹے مسائل یہاں تک کہ خواہش کے تاوان کا ذکر موجود ہے۔ اس کے بعد کیا تصور ہوسکتا ہے کہ خواہش کے مسئلہ کا حل موجود ہو اور اقتصادی مشکلات کا حل نہ ہو۔ یہ کیسی جامعیت ہے کہ خواہش کا تاوان طے کر دیا جائے اور زندگی کے اہم ترین پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے اور اس کی کوئی تنظیم نہ کی جائے۔جسم پر خراش لگ جائے تو مجروح کا حق معین کر دیا جائے اور پیدا ہونے والی ثروت میں کسی کا حق معین نہ کیا جائے۔مزدور اور سرمایہ دار کے حقوق کا تعین نہ کیا جائے۔

یہ کوئی عقل میں آنے والی بات ہے کہ شریعت خراش لگ جانے پر آپ کا حق مقرر کر دے اور زمین کے آباد کرنے، کان کے برآمد کرنے اور چشمہ کے نکالنے، جنگلات پر قبضہ کرنے میں آپ کے حقوق کا تعین نہ کرے۔کیا اس کا نام جامعیت ہے اور اس کو ہمہ گیری کہتے ہیں۔

شریعتِ اسلام اور مصادر و مخصوص شریعت پر ایمان رکھنے والا شخص اس حقیقت کو باور کر سکتا ہے کہ اسلام نے جملہ مشکلات حیات میں کس طرح معاشی مشکلات کا بھی حل پیش کیا ہے اور اس کی تنظیم کا انتظام کیا ہے بلکہ یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی اقتصادیات پر یہ کہہ کر اعتراض کرنا کہ اسلام افراد کے سلوک کا تعین کرتا ہے، اجتماع اور معاشرہ کا نہیں اور پھر اس بنیاد پر اسلامی معاشیات کا انکار کرنا ایک انتہائی غفلت کا کام

ہے۔گذشتہ روایات سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ اسلام کے دائرہ عمل میں کائنات کی ہر شے داخل ہے اس میں اجتماع اور افراد کا کوئی فرق نہیں ہے اور پھر یہ مذکورہ دعویٰ اسلامی روایات سے متصادم ہونے کے علاوہ ذاتی طور پر بھی احمقانہ اور غیر معقول ہے۔ وہ کون سا انسان ہے جو فرد کے معاملات کو معاشرہ سے الگ کر سکے اور یہ طے کر سکے کہ یہ مسائل افراد سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ مسائل اجتماع سے جبکہ اجتماع افراد کے مجموعہ ہی کا نام ہے اور افراد کا کوئی مسئلہ اجتماع سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

مثال کے طور پر سرمایہ دارانہ نظام ایک اجتماعی تنظیم ہے جس کا مقصد معاشی زندگی کو آزادی کی بنیادوں پر نظم کرنا ہے جس کا مظاہرہ سرمایہ دار اور عامل (ایجنٹ) سودخوار اور مقروض کے معاملات کی شکل میں ہوتا ہے یہ سب افراد اور یہ افراد کے مسائل ہیں جس کی اصل نظام اجتماعی ہے۔

یہی حال شریعت اسلام کا ہے کہ وہ افراد کے سلوک کو منظم کرتی ہے اور یہ طے کرتی ہے کہ کس مال کو بطور قرض لینے کسی شخص کو اجیر بنانے یا کسی وقت خود مزدوری کرنے میں انسان کا انداز کیا ہونا چاہیے۔ اور یہ مسئلہ افرادی ہونے کے باوجود اجتماعی تنظیم سے تعلق رکھتا ہے جہاں معاملہ میں طرفین کے برتاؤ کو طے کرنا ہوتا ہے۔

افراد کے سلوک کو اجتماع سے الگ کر دینا ایک قسم کا تناقض ہے جس کا امکان نہیں ہے۔ اسلامی شریعت کا ''افرادی سلوک'' کے منظم کرنے کے بارے میں اعتراف کر لینا خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اس میں اجتماعی تنظیم بھی پائی جاتی ہے۔

انطباق

روایات و ارشادات کے علاوہ ہماری سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ اسلامی اقتصادیات کے منکرین اس دور کے بارے میں کیا کہیں گے جب اسلامی قانون مکمل طور پر نافذ کیا گیا تھا اور اس کے دائرہ عمل میں اقتصادیات بھی شامل تھے۔ کیا ان لوگوں کے خیال میں صدر اسلام کے مسلمان ایک اسلامی اجتماعی زندگی نہیں گزار رہے تھے اور کیا

ان کا کوئی نظام نہیں تھا؟ کیا اس اجتماع کی قیادت سرکارِ دو عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اسلام کے ہاتھ میں نہیں تھی؟ کیا اس قیادت کے پاس سماج میں پیدا ہونے والے پیداوار اور تقسیم کے مسائل کا حل نہیں تھا؟ اور اگر تھا تو اسلامی نظام کے دعویٰ کا اور کیا مقصد ہوسکتا ہے؟ اور ہم اس کے علاوہ اور کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟۔ ہمارا مقصد تو یہی ہے کہ سرکارِ دو عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دور میں اسلامی معاشرہ موجود تھا اور اس کا تصور اقتصادی نظام کے بغیر ناممکن ہے۔ وہ کون سا معاشرہ ہے جس کا اقتصادی نظام غیر اسلامی ہے اور پھر معاشرہ اسلامی کہا جاتا ہے۔ معاشرہ پر سرکارِ دو عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حکومت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگرانی دلیل ہے کہ اس کے اقتصادی قوانین بھی آپ ہی کے قول وفعل وتقریر (تصدیق) سے ماخوذ تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معاشرہ میں جو انداز اختیار فرماتے تھے اسی انداز پر سارا معاشرہ چل رہا تھا اور یہی معنی اسلامی اقتصادیات کے وجود کے ہیں۔

نظام کو تشکیل کی ضرورت ہے

البتہ اسلام میں نظام اقتصادیات کے وجود سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اسلامی تشریعات وروایات میں اقتصادیات کے مسائل اپنی مخصوص شکل اور مخصوص اصلاح کے ساتھ موجود تھیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اسلامی نظام اقتصادیات سے ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ اسلامی قوانین میں ایسے ارشادات پائے جاتے ہیں کہ جنہیں مرتب کر کے فنی شکل دے دی جائے تو ایک مرتب نظامِ معیشت سامنے آسکتا ہے۔ اس کے پاس پیداوار، تقسیم اور تبادلہ وغیرہ کے تمام احکام موجود ہیں۔ صرف جدید تشکیل اور ترتیب کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر اسلام میں بنجر زمینوں کی آبادکاری کے مسائل، کان برآمد کرنے کے مسائل، کرایہ، مضاربہ، سود، زکواۃ، خمس، خراج، بیت المال وغیرہ کے مسائل ایسے ایسے ہیں جنہیں مرتب کرلیا جائے اور ان کے اصول ونظریات کا استنتاج کرلیا جائے تو ایک اقتصادی نظام تشکیل پاسکتا ہے۔

یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اسلام میں ''سرمایہ داری کی معاشی حریت'' کے مقابلہ

میں کوئی صریحی قانون موجود ہو اور اسلام یہ اعلان کرے کہ ہم معاشی میدان میں حریت یا خلاف حریت کے قائل ہیں۔ اس نے ایسے احکام وقوانین بیان کر دیئے ہیں جن کی روشنی میں یہ دریافت کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں معاشی حریت کا بدل کیا ہے۔ اور وہ اقتصادی نظام کو کن بنیادوں پر استوار کرنا چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر اسلام کا سودی کاروبار کو حرام کر دینا، زمین کو آباد کاری اور محنت کے بغیر اپنی ملکیت میں داخل کرنے سے منع کر دینا، حاکم اسلام کو قیمتوں کے تعین کا اختیار دے دینا۔ اس بات کی طرف کھلا اشارہ ہے کہ اسلام اقتصادی آزادی کے بارے میں کیا نظریہ رکھتا ہے اور وہ اس کے موافق ہے یا مخالف۔

اقتصاد کا اخلاقی پہلو

بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ اسلام میں اقتصادی نظام کا وجود نہیں ہے اور جس شے کو اقتصادی نظام تصور کیا جاتا ہے وہ ایک اخلاقی نظام ہے جس کے ذریعہ اسلام مسلمان کے نفس کی تربیت اور اس کا تزکیہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ جس طرح دین و مذہب ہونے کے ناطے مسلمان کو صداقت و امانت کی تعلیم دیتا ہے، صبر وحسنِ اخلاق پر آمادہ کرتا ہے۔ جعلسازی اور چغلخوری سے منع کرتا ہے۔ اسی طرح انہیں غرباء کی امداد اور فقراء کی اعانت کا حکم دیتا ہے۔ ظلم کرنے سے منع کرتا ہے اور مال داروں کو بیچارے انسانوں کے لئے ہمدردی پر آمادہ کرتا ہے۔ انہیں دوسروں کے حقوق غصب کرنے سے روکتا ہے اور ناجائز طریقے سے دولت جمع کرنے سے باز رکھتا ہے۔ نماز روزہ کی طرح کچھ مالی عبادتیں بھی مقرر کر دیتا ہے تا کہ مسلمان کے اخلاقیات درست ہوں۔ اس کا رشتہ پروردگار اور بندگانِ پروردگار سے مضبوط ہو، اس کے دل میں نیکی کے جذبات تربیت پائیں اور وہ ایک نیک اور صالح انسان بن جائے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کے پاس کوئی مستقل معاشی تنظیم ہے اور پورے معاشرے کو معاشی اعتبار سے ایک مخصوص راستہ پر چلانا چاہتا ہے۔ اخلاقی تعلیمات افراد کی اصلاح کے لئے ہوتے ہیں اور اقتصادی نظام معاشرہ کی تنظیم کے لئے۔ اخلاقی تعلیمات کو دیکھ کر اجتماعی نظام پر استدلال نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کا وجود

ثابت کیا جا سکتا ہے۔

اخلاقیات اور اقتصادیات کا فرق ایک واعظ اور مصلح کا فرق ہے۔ واعظ کا کام منبر پر جا کر لوگوں کو رحم و کرم کی دعوت دینا اور ظلم و بدسلوکی سے روکنا ہے۔ اس کی ذمہ داری سماجی اصلاح نہیں ہے۔ سماجی مصلح موعظ نہیں کرتا۔ نیک و بد کا اعلان نہیں کرتا۔ بلکہ ایک نظام تشکیل دیتا ہے اور ایسے حقوق و فرائض معین کرتا ہے جس کی روشنی میں سماج ایک مخصوص راستہ پر چل سکے۔

لیکن اس پوری تقریر کا واضح سا جواب یہ ہے کہ اسلامی ارشادات اس توجیہہ سے قطعاً ہم آہنگ نہیں ہیں کہ اس کے تمام بیانات کو چند اخلاقی تعلیمات پر محمول کر دیا جائے اور اس کے پیچھے کسی نظام کا اعتراف نہ کیا جائے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلامی تعلیمات میں اخلاق کا پہلو بہت واضح اور نمایاں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام کے پاس اخلاقی تعلیمات کا ایک ذخیرہ ہے جس سے انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں کام لیا جاتا ہے اور انہیں اقتصادیات میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام نے مسلمان کے نفس کے تزکیہ اور اس کے دل کے اندر جذبات کی خیر کی تربیت کے لئے بہترین طریقہ اختیار کیا ہے۔

لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اسلام صرف افراد کی تربیت پر توجہ دیتا ہے اور اجتماع کی تنظیم نہیں جانتا۔ وہ صرف ایک واعظ منبر ہے اور اسے اصلاح معاشرہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسلام نے ظلم و عدل کے تصورات کی حد بندی اور حقوق کی تحدید کے بغیر لوگوں سے ظلم و ستم سے روکنے اور عدل و انصاف پر آمادہ کرنے کا کام نہیں کیا۔ اس نے ظلم و عدل و حق کے مفاہم کو مبہم اور گنجلک نہیں چھوڑا اور نہ ان کی تفسیر کا کام کسی اور نظام کے حوالہ کر دیا ہے جیسا کہ واعظین کرام کا کام ہوتا ہے۔ اس نے ان تمام الفاظ کے معانی بھی معین کئے

ہیں۔ معاملاتِ زندگی میں ان کی حدیں بھی مقرر کی ہیں اور یہ بتایا ہے کہ پیداوار اور تقسیم یا تبادلہ میں کس طریقہ کار کو عدل کہا جاتا ہے اور کس کو ظلم، کس کا کیا حق ہے اور کس چیز کو حق سے تجاوز کہا جاتا ہے۔

وہ واعظ نہیں ہے۔ مذہب اور نظام ہے۔ واعظ عدل کی دعوت اور ظلم کی ممانعت کا کام انجام دیتا ہے لیکن عدل وظلم کے معیار کو معین نہیں کرتا۔ یہ کام عرف عام اور قانون کے حوالہ کر دیتا ہے جسے واعظ اور سامعین سب جانتے ہیں۔ لیکن نظام کی حیثیت اس سے بالکل مختلف ہے اس میں عدل وظلم کے معیار معین کئے جاتے ہیں اور انہیں معاشی زندگی پر منطبق کرنے کے طریقے طے کئے جاتے ہیں۔

اسلام اگر یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا کہ ظلم چھوڑ دو۔ عدل کو نافذ کرو، دوسروں پر زیادتی نہ کرو۔ اور ظلم وعدل کی تحدید کا کام لوگوں کے حوالہ کر دیتا کہ وہ طے کریں کہ عدل کس طرح مجسم ہوتا ہے اور ان کے حالات ومعارف واقدار کی روشنی میں عدل کے تقاضے کیا ہیں تو یقیناً اس کا مرتبہ ایک واعظ کا ہوتا ہے اور بس۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ جب ظلم کے ترک کرنے اور عدل کے نافذ کرنے کا حکم دیا تو پہلے عدل وظلم کے مفاہم طے کئے پھر پیداوار، تقسیم، تبادلہ میں عدل کے طریقہ کو ظلم کے طریقے سے الگ کیا اور پھر قوانین نافذ کئے۔ مثال کے طور پر اس نے اعلان کیا کہ زمین پر طاقت کے زور پر قبضہ کر لینا اور اس میں آبادکاری کی زحمت نہ کرنا ظلم ہے اور اسے آبادکاری کے ذریعہ قبضہ میں لینا جائز ہے۔ سرمایہ پر فائدہ کے نام سے سود لینا ظلم ہے اور اس کے فائدے میں شریک ہو جانا عدل ہے اور پھر اس کے بعد عدل کی دعوت دی اور ظلم سے منع کیا۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام نے مالداروں کو غریبوں کی اعانت و ہمدردی پر آمادہ کیا ہے اور انہیں ہمسایہ فقرا کے ساتھ نیک برتاؤ کی دعوت دی ہے اور یہ ایک بہترین اخلاقی تربیت ہے لیکن اس نے بات کو اس حد پر نہیں چھوڑا کہ اسے صرف اخلاقی تعلیم کہہ دیا جائے بلکہ حکومت کی ذمہ داری بھی قرار دی ہے کہ فقراء کے رزق کی ضمانت دے اور ان کے لئے

سامان زندگی فراہم کرے اور اس ذمہ داری کو اپنے معاشی نظام کا ایک جز قرار دے دیا۔

امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام مال زکواۃ میں والی کے فرائض کی تحدید کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ والی کا فرض ہے کہ وہ ان اموال کو لے کر ان آٹھ وجوہ میں صرف کرے جن کی طرف قرآنِ حکیم نے ارشاد کیا ہے۔

فقراء مساکین عاملین زکواۃ، مولفۃ القلوب، غلام، مسافر، غربت زدہ، مقروض، فی سبیل اللہ

اور فقرا و مساکین کو اس مقدار میں دے کہ وہ سال بھر کے خرچ سے بے نیاز ہو جائیں اور ان پر کوئی تنگی نہ رہ جائے اس کے بعد اگر بچ جائے تو والی کے اختیار میں ہے اور کم پڑ جائے تو والی کا فرض ہے کہ اپنے پاس سے پورا کر کے انہیں مستغنی بنائے۔

اس روایت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ معیشت کی ضمانت دینا اور بہترین زندگی کا فراہم کرنا صرف واعظانہ فکر نہیں بلکہ ایک والی مملکت کی ذمہ داری ہے جس کا تعلق پورے معاشرہ کی اصلاح سے ہے اور معاشرہ ہی کے ایک پہلو کا نام اقتصادی تنظیم ہے۔

یاد رکھئے کہ ہمارے پاس یہ روایت بھی ہے کہ اس شخص کا ایمان خدا اور آخرت پر نہیں ہے جو خود شکم سیر ہو کر سو جائے اور اس کا ہمسایہ بھوکا رہے لیکن یہ روایت گذشتہ روایت سے مختلف ہے۔ اس میں صرف فرد کی اخلاقی تربیت ہے اور اس میں والی کی ذمہ داری بھی ہے۔ فرد کی تربیت کو واعظانہ عمل کہا جا سکتا ہے لیکن سماج کی تشکیل و تنظیم کو واعظانہ عمل نہیں کہا جا سکتا۔ اور نہ اس کی معاشی نظام کے علاہ کوئی معقول توجیہہ کی جا سکتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ زکواۃ، نماز، روزہ کی طرح ایک عبادت ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کا اقتصادی تنظیم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ زکواۃ انفرادی عمل ہوتا تو اسے والی مملکت سے متعلق نہ کیا جاتا۔ والی سے متعلق کر کے عمومی ضمانت زندگی کا ذریعہ بنا دینا اس بات کی دلیل ہے کہ زکواۃ تمام دوسری عبادتوں سے الگ اسلامی نظامِ معیشت کا ایک جز ہے۔ اور اس کی حیثیت فقط اخلاقی نہیں ہے اس کے علاوہ خود زکواۃ کی تشریح کا انداز بھی

اس بات کی دلیل ہے کہ اسے اجتماعی نظام کا ایک جز بنا دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر زکواۃ کے بارے میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ وہ ناداروں کو اس مقدار میں دی جائے کہ زندگی کی عام سطح تک آجائیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کی نگاہ میں زندگی کی ایک سطح ہے اور وہ سارے معاشرہ کو اس سطح تک لانا چاہتا ہے اور اس نے فقرا کو وہاں تک لانے کے لئے زکواۃ کو ذریعہ بنایا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ کام واعظ کا نہیں ہے مصلح کا ہے۔ اسلام ایک تنظیمی فکر ہے اس کی تعلیمات صرف اخلاقی تعلیمات نہیں ہیں۔ اگرچہ ان میں اخلاقیات کا عنصر نمایاں طور پر نظر آتا ہے اور یہ اس کے اسلوب تنظیم کا شاہکار ہے۔

اسلامی نظام کا نقص؟

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلامی اقتصادیات کے منکرین سرمایہ داری اور اشتراکیت کے بارے میں اس قدر سخی کیوں ہیں۔ کہ انہیں بلا تامل اقتصادی نظام کا لقب دے دیتے ہیں۔ اور اسلامی قانون کے بارے میں اس قدر بخیل کیوں ہیں کہ اسے اس لقب سے محروم کر کے صرف اختلافی تعلیمات کا نام دیتے ہیں۔

کیا سرمایہ داری اور اشتراکیت میں کوئی ایسی خصوصیت پائی جاتی ہے جو اسلام میں نہیں ہے کہ انہیں اس لقب سے سرفراز کر دیا جائے اور اسلام کو محروم کر دیا جائے جبکہ اسلام نے انہیں مشکلات کو حل کیا ہے اور ان ہی مسائل کا علاج کیا ہے جن کا علاج کر کے راسمالیت اور اشتراکیت نے نظام کا نامہ حاصل کر لیا ہے۔ مثال کے طور پر اقتصادی مذاہب میں اختلاف کا مرکز ایک ملکیت کا مسئلہ ہے کہ سرمایہ داری کی نگاہ میں ملکیت کی اصل شخصی ملکیت ہے اور ہر شخص کو ہر طرح کے ثروت کا مالک بننے کا حق ہے۔ اس کے خلاف اسی وقت ہوسکتا ہے جب کوئی حتمی ضرورت اجتماعی ملکیت پر مجبور کر دے اور اشتراکیت کی نگاہ میں اصل اجتماعی ملکیت ہے۔ شخصی ملکیت صرف مخصوص حالات میں محدود طریقہ پر جائز کی جاسکتی ہے۔

اسلام کا موقف ان دونوں سے بالکل مختلف ہے نہ وہ اس افراط کا قائل ہے اور نہ اس تفریط کا۔ اس کی نگاہ میں ملکیت کا تصور مرکب قسم کا ہے یعنی اس کے نظام میں ملکیت شخصی بھی ہے اور اجتماعی بھی اور دونوں ایک مرتبہ میں ہیں۔ کسی کی حیثیت استثنائی نہیں ہے۔ صرف مزار و ملکیت الگ الگ ہیں۔ شخصی ملکیت کی جگہ اور ہے اور اجتماعی ملکیت کا سرمایہ اور۔ جس کی تفصیل آئندہ کتابوں میں بیان کی جائے گی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام اس انداز میں کون سی کمی رہ گئی ہے کہ شخصی ملکیت کے اعزاز کو مذہب کہہ دیا جائے۔ اجتماعی ملکیت کے اعلان کو نظام کا نام دے دیا جائے اور مرکب ملکیت کے قانون کو نہ مذہب کہا جائے نہ نظام۔ یہ ناانصافی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

دوسری مثال اکتساب کی ہے کہ ''پیداواری آلات'' کی ملکیت کے ذریعہ منفعت حاصل کی جاسکتی ہے یا نہیں۔

سرمایہ داری کا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص پیداوار کے آلات کا مالک ہے اور اس کے ذریعہ کمانا چاہتا ہے تو اس پر کسی طرح کی پابندی نہیں ہے۔ وہ سرمایہ کو دے کر سود بھی لے سکتا ہے اور اور مشین کو کرایہ پر دے کر کرایہ بھی لے سکتا ہے۔ اگر چہ دونوں صورتوں میں اس کا اپنا کوئی عمل اور اپنی کوئی محنت نہیں ہے۔

اشتراکیت نے ان دونوں طرح کے اکتساب کو حرام قرار دیا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ اپنی محنت اور اپنے عمل کے بغیر دولت حاصل کرنا ظلم صریح ہے۔ وہ نہ مال دے کر سود کو جائز قرار دیتی ہے اور نہ مشین دے کر اجرت لینے کو۔

اسلام نے ان دونوں سے الگ راستہ اختیار کیا ہے اور اس کا عقیدہ ہے کہ آلات کے ذریعہ بعض منافع جائز ہیں اور بعض حرام۔ مشین کو اجرت پر دے کر کرایہ لینا جائز اور مال کو قرض دے کر سود لینا حرام۔

ظاہر ہے کہ یہ تیسرا نظریہ ہے جو راسمالیت اور اشتراکیت سے مختلف ہے اور

دونوں کے نظریات سے بالکل الگ بنیادیں رکھتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ہی مسئلہ میں سرمایہ داری اور اشراکیت کوئی رائے قائم کرے تو اس کا نام اقتصادی نظام پڑ جائے اور اسی مسئلہ میں اسلام کوئی طریقہ اختیار کرے تو اس کا نام اقتصادی نظام پڑ جائے اور اسی مسئلہ میں اسلام کوئی طریقہ کار اختیار کرے تو اس کا نام اقتصادی مذہب یا نظام نہ پڑنے پائے۔ یہ ناانصافی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

جب کہ ایک ہی مسئلہ میں تین طرح کے نظریات ہیں۔ تو اگر دو نظریات اس بات کے اہل ہیں کہ انہیں اقتصادی نظام کا نام دیا جائے تو تیسرے کو بہرحال یہ حق ملنا چاہیے اور اسے کسی قیمت پر اس نام سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

اسلامی حکومت کا

مختصر اقتصادی خاکہ

﴿۲﴾

اسلامی حکومت کا مختصر اقتصادی خاکہ

میرا نفس ایک عجیب افتخار محسوس کر رہا ہے۔ میں ایک عظیم قوم (ملت ایران) سے خطاب کر رہا ہوں جس نے اپنے خون، اپنے جہاد مسلسل اور اپنی ہمت مردانہ سے از سرِ نو اسلام کی تاریخ مرتب کی ہے اور اسلام کے ان ابتدائی دنوں کو مجسم کر دیا ہے جن میں ہر طرف شجاعت وہمت اور ایمان وعقیدہ ہی کی جلوہ گری تھی۔

میرا یہ شعور اور بھی عمیق تر ہو جاتا ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ یہ قوم صرف اپنی تاریخ کے نئے موڑ کی تشکیل نہیں کر رہی ہے بلکہ پوری امت اسلامیہ کے لئے ایک نیا موڑ تیار کر رہی ہے۔ آج یہ قوم اسلامی جمہوریت کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرنے جا رہی ہے اور امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں قائم ہونے والی جمہوریت کے حق میں ووٹ دے کر پچھلی قربانیوں کے بعد دوبارہ اپنے ایمان باالاسلام کا اظہار کر رہی ہے۔ اور اپنے ایک لفظ ''ہاں'' سے (جو اسلامی جمہوریت کے حق میں استعمال ہونے والا ہے) مسلمانوں کی زندگی کے ایک نئے مرحلہ میں داخل ہو رہی ہے جہاں انسانیت کو ظلمات جاہلیت سے نکال کر نورِ توحید کی طرف لانا ہے اور انسان کی انسان پر حکومت کو اللہ کی بندگی میں تبدیل کر دینا ہے اور اس طرح حقیقی حریت اور عدالت وفسادات کا ایک نیا نظام تشکیل دینا ہے۔

یاد رکھئے! امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کا شعار ''جمہوری اسلامی'' کوئی نیا شعار نہیں ہے۔ یہ

وہی دعوت ہے جو انبیاء نے دی ہے۔ اور یہ اسی دور نبی (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) و علی (علیہ السلام) کا تسلسل ہے جس میں روئے زمین پر اللہ کی حکومت قائم کی گئی تھی یہ جمہوریت اس امت کے دل کی گہرائیوں کی تعبیر ہے جس نے یہ سمجھ لیا ہے کہ عزت صرف اسلام میں ہے اور امت کیلئے ذلت بے عزتی۔ پریشان حالی، محرومیت اور غلامی صرف اسلام سے الگ ہو جانے کی بناء پر ہے۔

اسلامی شریعت زندگی کے دوراہوں میں سے ایک اختیاری راستہ نہیں ہے۔ یہ ایک معین راستہ ہے جس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ یہ ایک حکم الٰہی اور فیصلہ خداوندی ہے۔ یہ روئے زمین کے لئے ایک تنہا شریعتِ پروردگار اور قانونِ کردگار ہے۔

کسی مومن یا مومنہ کو خدا اور رسول کے فیصلہ کے بعد اپنی طرف سے اختیار کرنے کا حق نہیں ہے۔ [1]

امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ نے اس رائے شماری کے ذریعہ یہ بتایا ہے کہ امت ایران کے ایمان و عقیدہ کا اظہار ہو جائے اور یہ دنیا دیکھ لے کہ یہی ایک قوم عقل و ہوش اور فکر و نظر کے ساتھ اس امانت کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہے۔

ملت ایران! تم نے اسلامی جمہوری کو زندگی کا لائحہ عمل اور حکومت کی بنیاد قرار دے کر ایک عظیم فریضہ الٰہیہ کو ادا کیا ہے اور اس عظیم تجربہ کو دہرانے کی کوشش کی ہے جس کے لئے پیغمبر اسلام نے اپنی پوری زندگی صرف کر دی تھی اور جس نظریہ کو رائج کرنے کے لئے امیر المومنین (علیہ السلام) نے باغیوں، منافقوں اور خارجیوں سے جہاد کیا تھا اور جس روحِ انقلاب کو زندہ کرنے کیلئے امام حسین علیہ السلام نے اپنے کا خون کا آخری قطرہ تک دے دیا تھا۔

تم نے اسلامی جمہوریت کو اختیار کر کے تیرہ سو سال پہلے کربلا کی زمین پر بہہ جانے والے مقدس خون کا مقصد پورا کر دیا ہے۔ تم نے عقل و ہوش کے ساتھ اسلام کو منہاجِ زندگی قرار دے کر مغربی تمدن کو ایک کھلا چیلنج دیا ہے اور اس کی فکری بنیادوں اور

---

[1] سورۂ احزاب: ۳۶

تمدنی خیالات کوللکارا ہے۔

تم نے شاہ کوتخت سے اتارکراوراس کی حکومت کا خاتمہ کر کے مغربی سیاست کے مصالح اوراس کے عملی تصورات کوفنا کر دیا ہے۔

یورپ اور امریکہ کے انسانوں کے درمیان پائے جانے والے تمدن کا خیال تھا کہ اس نے اسلام کا صفایا کر دیا ہے اور سیاسی،فوجی یا ثقافتی بنیادوں پر مسلمانوں کو اسلام سے الگ کر کے مغربی تمدن کی تقلید پر آمادہ کرلیا ہے۔اب مسلمان مغرب کی تقلید ہی کو فریضہ حیات اوراصول زندگی سمجھتا ہے۔

یورپ کے مغربی بازو کا نعرہ تھا کہ یورپ کی ساری ترقی دین سے جدائی کی بنیاد پر ہوئی ہے اور مشرقی بازو کا اعلان تھا کہ دین قوموں کے لئے ایک افیون تھا۔جوقوم حریت کی آزادی کی جنگ لڑنا چاہتی ہے اسے پہلے دین سے الگ ہونا پڑے گا۔

تم نے ان دونوں پروپیگنڈوں کو غلط ثابت کر دیا اور اپنی حقیقی اور واقعی تجربہ حیات سے ثابت کر دیا کہ ملت ایران کے تنزل کا کل راز دین سے علیحدگی اور شہنشاہیت کی غلامی میں پوشیدہ تھا جس کا مقصد جاہلیت کے افکار واقدار کی تعبیر وتشریح کے سوا کچھ نہ تھا۔ دین تنہا طاقت ہے جس نے انقلاب کی دعوت دی اور طاغوت کوتباہ وبرباد کر دیا اور اب یہی دین ہے جوتمہاری زندگی کا مکمل دستور اور تمہاری تعمیر نو کی بنیاد بن رہا ہے۔

کیا اسلام دستور زندگی ہے۔

مغرب اور مغرب کے مارے ہوئے دانشور ایک عرصے سے یہ پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ اسلام ایک مذہب ہے، انقلاب نہیں ہے۔انسان اور پروردگار کے درمیان ایک رابطہ ہے۔اجتماعی انقلاب کی بنیاد بننے کے قابل نہیں ہے۔

یہ بے چارے بھول گئے ہیں کہ اسلام ایک انقلاب ہے جس میں زندگی عقیدہ ہے اور اجتماعی پہلو روحانی رُخ سے جدانہیں کرسکتا۔اسلام تاریخِ کائنات کا اکسیر اورانوکھا انقلاب ہے۔

اسلام میں توحید کا عقیدہ جو ہر عقیدہ کی روح ہے اور جس کے ذریعہ انسان غیر خدا کی بندگی سے آزاد ہو جاتا ہے اس نے تاریخ کے تمام مہمل خداؤں کو ٹھکرا کر انسان کو داخلی آزادی دلائی ہے اور پھر اس کو خارجی آزادی کی بنیاد بنا کر اپنے انقلاب اور اپنی کائنات کو خدا کے علاوہ ہر ایک سے آزاد کرالیا ہے جو انسان کی خارجی آزادی ہے۔

امیر المومنینؑ نے اس حقیقت کا اعلان ان الفاظ میں فرمایا تھا کہ بندے اللہ کے بندے ہیں اور مال اللہ کا مال ہے اور اسی ذریعہ تمام فرضی پابندیوں و رتاریخی رکاوٹوں کو دور کر دیا ہے جن کے ذریعہ انسان کی ترقی اور اس کی راہِ خدا میں سعی و کوشش کو روکا جا رہا تھا۔ چاہے ان پابندیوں کی نوعیت خداؤں، توہمات اور اساطیر کی ہو۔ جن کا کام انسان کو وساطیری خیالات کے سامنے جھکا دینا ہے۔ یا ان کی حیثیت بادشاہوں کی ہو جن کا کام روئے زمین پر حکومت کرنا ہے وہ فرد کی حکومت ہو یا جماعت اور طبقہ کی حکومت جس کا کام انسان کی فطری ارتقاء کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر کے اس کا بندہ حکومت اور غلام اقتدار بنا دیتا ہے اور اسی بنیاد پر اسلام جس کے لئے انبیاء و مرسلین نے جہاد کیا ہے ظلم و طغیان کے خلاف ایک اجتماعی انقلاب بن گیا اور اس نے استحصال و غلامی کی تمام قسموں کو تباہ و برباد کر دیا۔

اسی لئے اس مشعل ہدایت کے علمبردار انبیاء ہمیشہ روئے زمین کے ستارے ہوئے۔ غربا و فقراء کے ساتھ رہے کہ انہیں روحانی اعتبار سے اسطوری خداؤں نے پراگندہ کر دیا ہے اور فکری اعتبار سے جاہلیت نے انتشار کا شکار بنا دیا ہے اور اس طرح ہر استحصال اور اجتماعی ظلم کا لقمہ اجل بنا دیا ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ انبیاء کا انقلاب دنیا کے تمام دوسرے اجتماعی انقلابات سے الگ نوعیت کا حامل تھا اس انقلاب نے انسان کو باطن سے آزاد کرا دیا ہے اور کائنات کو خارج سے اور دونوں ایک ساتھ کام کئے ہیں۔ ایک کا نام جہاد اکبر رکھا ہے اور دوسرے کا نام جہاد اصغر۔ اسے یہ معلوم ہے کہ جہاد اصغر (خارجی آزادی) کا کام جہاد اکبر (روحانی آزادی) کے بغیر ناممکن ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ

۱۔ اسلامی انقلاب نے ایک استحصال پسند کی جگہ دوسرے

استحصال پسند کو نہیں بٹھایا۔ اس نے سرکشی کو سرکشی سے نہیں بدلا۔ یہ بات ممکن ہوتی اگر اس کا انقلاب صرف خارجی انقلاب ہوتا لیکن اس نے انقلاب کا کام داخل سے شروع کیا ہے جہاں انسان کے تصورات ہی بدل دیئے ہیں اور اس کے نفس سے استحصال پسندی کی جڑیں اکھاڑ کر پھینک دی ہیں۔ اس کا کھلا ہوا اعلان ہے۔

ہمارا ارادہ ہے کہ روئے زمین کے کمزوروں پر احسان کر کے انہیں امام بنائیں اور انہیں کو وارثِ زمین قرار دیں۔ [1]

آیت کریمہ میں آزادی کے دونوں رخ پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں اور امامت و وراثت کا تذکرہ ایک ساتھ دکھائی دیتا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ استحصال پسندوں کی جگہ کمزوروں کا آنا اور ان کا زمامِ حکومت کو سنبھال لینا خارجی آزادی ہے جو انہیں وراثت میں ملی ہے لیکن اس کے پہلو بہ پہلو امامت ہے جس نے انہیں اتنا بلند کر دیا ہے کہ وہ قیادت کی صلاحیت کے حامل ہو گئے ہیں اور انسانیت کے لئے ایک نمونہ عمل بن گئے ہیں۔

انبیاء کے ہاتھوں پیدا ہونے والی انقلابی تبدیلی ویسی نہیں ہے جیسی تبدیلی جاگیردار کی جگہ سرمایہ دار کے آنے سے سرمایہ دار کی جگہ مزدور کے آنے سے ہوتی ہے کہ اس میں صرف جگہ بدلی جاتی ہے آدمی وہی رہتا ہے۔ اسلام کا انقلاب ایک ایسا داخلی انقلاب ہے جہاں استحصال کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور ظلم کی تمام قسمیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اب نیا آنے والا پرانے خیالات کا انسان نہیں ہوتا بلکہ نئے انداز کا انسان ہوتا ہے جس میں امامت و قیادت کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور جس کے جذبات وخیالات ہوتے ہیں۔

دوسرے مقام پر قرآن مجید نے ان کمزور اور مستضعف انسانوں کا تعارف بھی کرایا ہے جن کے ہاتھوں میں زمامِ حکومت دی ہے کہ ان کی کیفیت کیا ہے اور ان کے کردار کا اندازہ کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] سورۂ قصص:۵

یہ وہ لوگ ہیں کہ انہیں زمین کی حکومت دے دی جائے تو نماز
قائم کریں گے۔ زکواۃ ادا کریں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے، برائیوں
سے منع کریں گے اور ہر شے کا انجام اللہ کے ہاتھوں میں ہے۔ [1]

۲۔ انبیاء کا ظلم واستحصال سے مقابلہ طبقاتی نوعیت کا نہیں تھا جیسا
کہ عام طور پر اجتماعی انقلابات میں ہوا کرتا ہے۔ یہ خالص انسانی
انقلاب تھا۔ جس میں انسان کے داخلی کیفیات کو پہلے آزاد کرایا گیا
تھا اس کے بعد اجتماعی انقلاب اور آزادی کو اس عمارت کی دوسری
منزل قرار دیا گیا تھا اور اس لئے داخلی آزادی کو جہاد اکبر اور خارجی
آزادی کو جہاد اصغر سے تعبیر کیا گیا تھا۔

اسلام نے داخلی آزادی اور جہاد اکبر کے ذریعہ انسانی نفس میں خیر وعطا کے تمام جذبات پیدا کر دیئے ہیں اور اس کے اندر ایجاد وابداع کی تمام چھپی ہوئی صلاحیتوں کو ظاہر کر دیا چاہے اس کا تعلق کسی طبقے سے کیوں نہ ہو۔ یہاں ظلم وطغیان کے مقابلہ میں فقیر اور غنی ایک صف میں کھڑے ہوتے ہیں اور اس کا موقع نہیں دیا جاتا کہ کل کے استحصال کا مارا ہوا آج کا استحصالی بن جائے بلکہ دونوں ایک منزل پر صف آراء ہو کر نفس سے جہاد کرتے ہیں۔

پیغمبرانہ بنیادوں پر جہاد کرنے والا مجاہد وہ انسان نہیں ہے جس کا تصور یہ ہو کہ انسان کی قدر و قیمت وسائل پیداوار کی ملکیت اور زمین مالکیت سے پیدا ہوئی ہے کہ وہ اپنے استحصالیوں سے زمین اور جاگیر حاصل کرنے کی فکر میں لگ جائے اور یہ تصور کرے کہ انسانی قدر و قیمت اس ملکیت میں مضمر ہے اور اس طرح سارا جہاد اونچے نیچے طبقہ کا جہاد ہو جائے اور انسان نچلے طبقہ سے نکل کر اونچے طبقہ میں داخل ہونے کی فکر کرے۔

یہاں کا مجاہد وہ ہے جس کا عقیدہ ہے کہ انسان کی قدر و قیمت اللہ کی طرف تیز قدم بڑھانے، انسانی اقدار کے حامل ہونے اور استحصال کو انسانیت کی توہین اور راہِ خدا میں

---

[1] سورۂ حج: ۴۱

رکاوٹ سمجھ کر اس کے خلاف بے پناہ جنگ چھیڑنے میں ہے جہاں نہ مال کی کثرت راہِ خدا سے غافل کرسکتی ہے اور نہ جمع آوری اور ذخیرہ اندوزی کا جذبہ مقصد سے ہٹا سکتا ہے۔ مجاہد کی یہ کیفیت سماجی حیثیت اور طبقاتی نسبت سے نہیں پیدا ہوئی بلکہ جہادِ اکبر کے مرحلہ پر کامیابی سے پیدا ہوئی ہے جو جہاد اکبر (جہاد نفس) کی منزل میں جس قدر کامیاب ہوگا۔ جہاد اصغر کے لئے اتنا ہی صلاحیت و استعداد کا حامل ہوگا۔

جہاد اکبر کی کامیابی کے بغیر مجاہد کو جہاد اصغر کی منزل میں قدم رکھنے کا حق نہیں ہے اور نہ ایسا مجاہد اسلامی مجاہد پیغمبری انقلابی کہا جاسکتا ہے۔

خلافت انسان

اسلام نے کائنات میں ملکیت خدا کے قانون کا اعلان کرنے کے بعد اس کا حتمی نتیجہ یہ قرار دیا کہ انسان روئے زمین پر اس کا جانشین اور مصادر ثروت پر اس کے امین کی حیثیت رکھتا ہے تا کہ امورِ طبیعی کا انتظام کرے اور ملکیت خدا کی روح کے مطابق اس کا اہتمام کرے، ارشاد ہوتا ہے:

اس مال میں سے خرچ کرو جس پر تمہیں خلیفہ بنایا گیا ہے۔[۱]

لوگوں کو اس مالِ خدا میں سے دو جو اللہ نے تمہیں عطا کیا ہے۔[۲]

اس خلافت اقتصادیہ کے دو مرحلے ہیں۔

پہلے مرحلہ پر پوری انسانی برادری کو خلافت سپرد کر دی گئی ہے اور ملکیتِ عام کا اعلان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اپنے وہ اموال جن پر اللہ نے تمہیں نگران بنایا ہے احمقوں کے حوالے نہ کرو۔[۳]

---

[۱] سورۂ حدید: ۷

[۲] سورۂ نور: ۳۲

[۳] سورۂ نساء: ۵

اس آیت کریمہ میں سفیہ لوگوں کے اموال کی گفتگو کی گئی ہے اور جماعت کو حکم دیا گیا ہے کہ ان اموال کو **سفہاء** کے حوالے نہ کریں اور قانون کو اس شکل میں بیان کیا گیا ہے کہ مال کو جماعت کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ گویا یہ انہیں کا مال ہے حالانکہ یہ واقعتاً ان کا مال نہیں ہے **سفہاء** کا مال ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں اموال جماعت کی زندگی قائم کرنے اور انہیں پر سکون زندگی کے ساتھ مقاصد الٰہیہ کی تکمیل کرنے کے لئے ہیں اور یہ کام **سفہاء** کے امکان میں نہیں ہے لہٰذا انہیں خود اپنے اموال میں بھی ہاتھ لگانے سے روک دیا گیا ہے۔

دوسری طرف یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ قرآن کریم اور فقہ اسلامی میں کفار سے ہاتھ آنے والی تمام طبیعی ثروتوں کو لفظِ فیء سے یاد کیا گیا ہے جس کے معنی پلٹ آنے کے ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ اسلام میں یہ ثروتیں دراصل پوری انسانی برادری کے لئے ہیں اور انسان کو بحیثیت انسان ان کا مالک اور اللہ کا جانشین بنایا گیا ہے۔

اب یہ پوری برادری خلافت کے ناطے اللہ کی بارگاہ میں جوابدہ ہے اور اس جواب دہی کے حدود یہ ہیں۔

> خدا وہ ہے جس نے آسمان وزمین کو پیدا کیا ہے۔ آسمان سے پانی برسا کر تمہارے لئے رزق کے لئے پھل پیدا کئے ہیں تمہارے لئے کشتیوں کو مسخر کیا ہے کہ حکم خدا سے سمندروں میں چلیں۔ تمہارے لئے نہریں، آفتاب، ماہتاب، دن رات سب کو مسخر کر کے تمہارے ہر سوال کے مطابق تمہیں عطا کیا ہے۔ تم اللہ کی نعمتوں کو شمار بھی کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے ہو۔ مگر انسان بڑا ظالم اور ناشکرا ہے۔ [1]

آیت نے کائنات کی ثروتوں، طاقتوں، نعمتوں کا تذکرہ کرنے کے بعد انسان کے دو طرح کے انحرافات کا تذکرہ کیا ہے ایک ظلم اور ایک کفرانِ نعمت۔ ظلم کے معنی غلط

---

[1] سورۂ ابراہیم: ۳۴

نظام تقسیم اور نعمتوں کا تمام افراد جماعت کے لئے مہیا نہ ہونا یعنی بعض افراد کا بعض پر ظلم کرنا اور کفران نعمت کے معنی جماعت کا ان تمام ثروتوں، نعمتوں اور طاقتوں سے صحیح طور پر استفادہ نہ کرنا اور تسخیر کائنات میں کوتاہی کرنا جبکہ اللہ کی طرف سیر کمال اسی استفادہ پر موقوف ہے۔ یہ جماعت کا خود اپنے نفس پر ظلم ہے اور اسی اشارے سے جماعت کی دو طرح کی ذمہ داریاں واضح ہوجاتی ہیں۔

۱۔ ثروت کی تقسیم میں عدالت سے کام لینا چاہیے۔ اور کوئی ایسا تصرف نہ ہونا چاہیے جو خلافت عام کے منافی اور تمام انسانی برادری کے حقوق سے متصادم ہو۔

۲۔ ثروت کی نگرانی میں بھی انصاف سے کام لینا چاہیے اور حتی الامکان تمام طاقتیں صرف کر کے اس سے استفادہ کرنا چاہیے اور غیر آباد زمینوں کو آباد کر کے نعمتوں کی توقیر وتکفیر کا کام انجام دینا چاہیے۔ استخلاف کا دوسرا مرحلہ افراد کی جانشینی کا ہے جسے فقہی اور قانونی زبان میں شخصی ملکیت کہا جاتا ہے اور جہاں فرد جماعت کی جانشین ہوتی ہے اور اسی لئے آیت کریمہ نے افراد کے اموال کو جماعت کی طرف منسوب کیا ہے اور یہ واضح کر دیا ہے کہ کسی فرد کو کوئی ایسی ملکیت حاصل نہیں ہے جو جماعت کی خلافت کے منافی اور اس کے عمومی حق سے متعارض ہو۔ اور جب تک شخصی ملکیت جماعت کی جانشینی کی بنیاد پر رہے گی فطری طور پر ہر فرد کو اپنے تصرفات کو عمومی مفادات سے ہم آہنگ ہونا پڑے گا اور جماعت کے شرعی نمائندہ (بنی، امام، حاکم شرع) کو اختیار ہوگا کہ فرد کوئی تصرف جماعتی مفادات کے خلاف کرے تو اس سے ملکیت سلب کر لے اور اسے بیدخل کر دے جیسا کہ حضور سرورِ کائنات نے سمرہ ابن جندب کے واقعہ میں کیا ہے کہ سمرہ کا ایک کھجور کا درخت ایک مردِ انصاری کے مکان سے متصل تھا اور اس کا راستہ مردِ انصاری کے مکان کے اندر سے تھا۔ سمرہ برابر اپنے درخت تک بلا اجازت جایا کرتا تھا۔ مردِ انصاری نے اسے ٹوکا اور اجازت طلب کرنے کی خواہش کی۔ سمرہ نے جواب دیا کہ درخت میری ملکیت ہے اور ملکیت تک جانے کے لئے اجازت کی کوئی ضرورت نہیں۔ مرد انصاری نے حضور سرورِ

کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام سے شکایت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سمرہ کو سمجھایا اور فرمایا کہ تم اس درخت کو چھوڑ دو میں دوسری جگہ دوسرا درخت دے دوں گا۔ اس نے کہا یہ تو نہیں ہوسکتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تو صرف لوگوں کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے اور اسلام میں ایسے لوگوں کا گزر نہیں ہے۔ یہ کہہ کر حکم دیا کہ درخت اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں شخصی ملکیت کا دائرہ اجتماعی ملکیت کے اعتبار سے معین ہوتا ہے اور فرد کو جماعت کے حقوق میں تعدی کرنے کا حق نہیں ہے۔

اسلام میں اجتماعی عدالت کا قانون اس کے عدلِ الٰہی کے عقیدہ کا اجتماعی رُخ ہے جس کا اعلان انبیاء نے کیا اور جس کی تاکید آسمانی شریعتوں نے کی اور جسے اصولِ دین میں توحید کے بعد بلا فاصلہ دوسرا درجہ دیا گیا ہے۔

عدلِ الٰہی کے بارے میں اس قدر اہتمام اور اسے تمام صفات الٰہیہ کے درمیان اصول دین کا مرتبہ دینا صرف اس لئے ہے کہ عدالت کا ایک اجتماعی مفہوم ہے اور وہ اس روح انقلاب سے گہرا ارتباط رکھتا ہے جس کی دعوت انبیاء ومرسلین نے دی ہے اور جسے اللہ والوں نے حقیقت کی سرزمین پر برپا کیا تھا۔

توحید کا اجتماعی مفہوم یہ ہے کہ کائنات اللہ کی ملکیت ہے۔ کسی دوسرے مہمل خدا کو تصرف کرنے کا حق نہیں ہے اور عدالت کا اجتماعی تصور یہ ہے کہ خدا کسی فرد کو دوسرے فرد پر مقدم نہیں کرتا اور کسی ایک جماعت کیلئے دوسری جماعت کے حقوق ضائع کرتا ہے اس نے پوری صالح اور صحت مند انسانی برادری کو پوری کائنات کی ثروتوں میں اپنا خلیفہ اور جانشین بنا دیا ہے اور سب کو مجموعی طور پر اس تصرف کا ذمہ دار اور مسئول قرار دیا ہے۔

مقاصد خلافت

اسلام نے خلافت کا قانون وضع کرنے اور انسانی برادری کو اللہ کا جانشین بنا دینے کے بعد ان مقاصد کا بھی تعین کر دیا ہے جنہیں اس خلافت کے ذریعہ حاصل کرنا ہے اور جن کے ذریعہ تصورات وافکار میں انقلاب برپا کر دیا ہے جس سے اسلوبِ عمل اور

طریقہ کار کا تعین خود بخود ہو جائے اس لئے کہ جس طرح کا مقصد ہوگا اسی انداز کا طریقہ کار اختیار کرنا ہوگا۔ زندگی کے افکار اور مقاصد کی تجدید کے سلسلے میں اتنا بڑا انقلاب برپا کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ پہلے مقاصد کا الٰہی تصور پیش کر دیا جائے اور اس کے بعد عالمِ نفسیات میں اسے اختیار کرنے کی بنیاد بھی پیدا کر دی جائے تا کہ مقاصد قبول کر لئے جائیں اور ان کی تحصیل کے لئے کوشش کی جائے۔

سوال یہ ہے کہ اہداف و مقاصد کی منزل میں اسلام کس طرح کا تغیر چاہتا ہے اور اس کا منشا کیا ہے؟

جاہلی معاشروں نے انسانی زندگی کو انتہائی محدود نگاہوں سے دیکھا ہے اور اس کا سلسلہ موت پر تمام کر دیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنی ذات اور اپنی لذت کا ادراک صرف ان خواہشات کی تکمیل سے کرتا ہے جو اس کے نفس کے اندر پائی جاتی ہیں اور اس طرح مال بحیثیت مالی، اس کی جمع آوری، ذخیرہ اندوزی اور اس کی راہ میں مقابلہ انسان کا ایک فطری مقصدِ حیات بن جاتا ہے۔ جہاں اس کی تمام تر فکر یہی ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ دولت کمائی جائے اور کیف و کم کے اعتبار سے جس قدر ممکن ہو اس کی بقا کا انتظام کیا جائے۔

حیات کے اس تصور اور مال کی اس بنیادی حیثیت نے جو جاہلی معاشرہ میں کثرت مال اور توسیع دولت کا رجحان پیدا کر دیا اور سماج طرح طرح کے تناقضات اور استحصال کا شکار ہو گیا۔ میدان محدود، پتے گنے چنے اور کھلاڑی بے پناہ اور خوش نصیب بھی وہی جس کے حصہ میں زیادہ پتے آ جائیں تو کھلی ہوئی بات ہے کہ اس کے نتیجہ میں سوائے ذخیرہ اندوزی اور استحصال کے کچھ نہ ہوگا۔ اسلام نے اس تصور کو مٹانے اور انسان کے نفس کی گہرائیوں سے اس کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے مال کی ذخیرہ اندوزی، جمع آوری اور کثرت مال کو ہدفِ زندگی بنا دینے کی بدترین مذمت کی ہے اور یہ واضح کر دیا ہے کہ مال نہ انسان کو بقائے دوام دے سکتا ہے نہ اس کے حقیقی وجود کا سبب بن سکتا ہے۔

''ویل ہے ہر اس عیب جوئی کرنے، طعنہ دینے والے کے لئے

جس نے گن گن کر مال جمع کیا ہے اور اس کا خیال ہے کہ یہ مال اسے ہمیشہ باقی رکھے گا۔ ہرگز نہیں۔ اسے حطمہ میں پھینک دیا جائے گا۔ اور تم کیا جانو کہ حطمہ کیا ہے وہ ایک اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو سینوں پر بھڑکتی ہے"۔ [۱]

"تمہیں فکر کثرت مال نے غافل بنائے رکھا یہاں تک کہ تم قبروں تک پہنچ گئے۔ عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا اور خوب معلوم ہو جائے گا۔ کاش تمہیں علم الیقین ہوتا۔ عنقریب تم جہنم کو دیکھو گے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین کر لو گے۔ [۲]

جو لوگ سونے چاندی کے خزانے جمع کرتے ہیں اور راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے دو جب یہ خزانے آتش جہنم میں گرم کئے جائیں گے اور اس سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشتوں کو داغا جائے گا کہ یہ تمہارا خزانہ ہے جسے تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا۔ اب اپنے خزانے کا مزہ چکھو۔ [۳]

اس کے بعد اسلام نے فقط زندگی کے جاہلانہ تصور اور اس کے جاہلیتی اقدار و مقاصد ہی کا انکار نہیں کیا بلکہ مثبت طور پر ایسا مقصد بھی بیان کر دیا جس کی روشنی میں راستہ طے کرنا ضروری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھوں میں ملک ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔ اس نے موت و حیات کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ تمہارا امتحان لے کہ تم میں حسن عمل کے اعتبار سے سب سے بہتر کون

---

[۱] سورہ ہمزہ: ۱ تا ۵

[۲] سورۂ تکاثر: ۱۔۷

[۳] سورۂ توبہ: ۳۴

ہے اور وہی خدا عزیز ہے اور غفور بھی۔ [۱]

مقصد یہ ہے کہ مال کی کثرت اور ثروت کی فراوانی کے بجائے حسن عمل انسانیت کا بہترین نمونہ اور بلند ترین مقصد ہے جس کے لئے اللہ نے انسانی جماعت کی تربیت کا ذمہ دار انبیاء کو حکم دیا ہے کہ انہیں راہ عمل میں مقابلہ پر آمادہ کریں اور کارِ خیر کے میدان میں آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا کرائیں۔ اس مسئلہ میں مقابلہ کرنے والے باہمی مقابلہ کریں۔ [۲]

اسلام نے اپنے جدید ترین مقصد حیات کو واقعی بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے میدان زندگی پر ایک نئی نظر ڈالی اور اسے ایک غیر محسوس عالم سے مربوط بنا دیا اور یہ واضح کر دیا کہ بقا دوامِ عمل کے لئے ہے مال و دولت کے لئے نہیں ہے اور یہ بقا اس عالم شاہد و احساس میں نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے عالم میں ہے اور اس تصور کو انسان کے نفس کی گہرائیوں میں یوں جا گزیں بنا دیا کہ انسان اپنے سارے اعمال کو اس عالمِ حق و حقیقت کے اعتبار سے مرتب و منظم کرے اور اس میں یہ شعور پیدا ہو جائے کہ انسان کی بقا عمل صالح سے ہے مال جمع کرنے اور ذخیرہ اندوزی کرنے سے نہیں ہے۔ جس کے بعد راہِ خدا میں خرچ کا تصور بدل جائے گا اور انسان یہ محسوس کرے گا کہ انفاق کے معنی مال کے خرچ کرنے اور منتشر کر دینے کے نہیں ہیں بلکہ انفاق کے معنی خود انسان کی بقا اور اس کے دوام کے ہیں جہاں خرچ بلا معاوضہ نہیں ہوتا بلکہ مال کے عوض بھی حیات دوام اور بقائے خلود ہاتھ آتی ہے اور یہ ایک ایسی تجارت ہے جس میں فائدہ ہی فائدہ ہے اور اس کے ذریعہ عمل کرنے والے کو ایک روحانی کیف اور مستقبل کے حسین تصور کی لذت حاصل ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

---

[۱] سورۂ ملک: ۱۔۲

[۲] سورۂ مطففین: ۲۶

جو شے بھی تم راہِ خدا میں خرچ کرتے ہو اللہ اس کی جگہ پُر کر دیتا ہے۔[1]

جو شخص بھی ایک نیکی کرے گا اسے دس گنا ملے گا۔[2]

اگر تم اللہ کو قرض دو گے تو وہ اسے تمہارے لئے دگنا کر دے گا۔[3]

جو لوگ راہِ خدا میں مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس دانہ کی ہے جس سے سات بالیاں پیدا ہوں اور ہر بالی میں سو دانے آئیں اور اللہ جس کے لئے چاہتا ہے زیادہ بھی کر دیتا ہے اس کے یہاں بڑی وسعت ہے اور وہ بڑا صاحبِ علم ہے۔[4]

اسلام کے اصول دین کی پانچویں اصل عقیدۂ معیار کا بھی ایک اجتماعی اور انقلابی پہلو ہے جس نے انبیاء کے انقلابی اقدامات میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے اور انبیاء کے بنائے ہوئے صالح انسان نے جن افکار و اقدار کو اپنانا چاہا ہے ان کے لئے اساس اور بنیاد کا کام ہے۔

اس کے بعد اگر اس حقیقت کا اضافہ کر لیا جائے کہ نبی آسمانی پیغام کا حامل اور الٰہی انقلاب کا قائد ہوتا ہے اور امامت اس کی نیابت میں ثبوت کی ذمہ داریوں کے مرحلہ نقل و انتقال و توسیع و اقتدار کا نام ہے جس کا کام یہ ہے کہ انقلاب کی ایسی نگرانی کرے کہ اُمت مقصود انقلاب تک پہنچ جائے، تو یہ نتیجہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کے وہ اصول دین جو عقائدی سطح پر جوہر اسلام اور مفہوم پیغام الٰہی کی ترجمانی کرتے ہیں وہی اصول بعینہ اجتماعی میدان میں اس بنیادی انقلاب کی عکاسی کرتے ہیں جس کی قیادت انبیاء و مرسلین نے کی ہے اور جس کا مقصد روئے زمین پر انسانی خلافت کی راہیں ہموار کر دینا اور

---

[1] سورۂ سباء: ۳۹

[2] سورۂ انعام: ۱۶۰

[3] سورۂ تغابن: ۱۷

[4] سورۂ بقرہ: ۲۶۱

اس کے لئے نشان منزل کا تعین کر دینا ہے۔

اسلام ثابت ہے اور زندگی تغیر پذیر

اکثر تشکیک پسند لوگ یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اسلام ''بیسویں صدی'' کے اقتصادی مسائل کا حل نہیں پیش کر سکتا۔ زمانہ میں چودہ صدیوں کے اندر بیشمار اجتماعی اور اقتصادی تغیرات ہو چکے ہیں اور اسلام وہی قدیم اسلام ہے۔ ایسا اسلام آج کے پیچیدہ مسائل کا حل نہیں پیش کر سکتا۔ لیکن اس کا واضح سا جواب یہ ہے کہ اسلام اپنے زندہ اصولوں کی بنیاد پر آج بھی زندگی کی قیادت اور اس کی تنظیم کا فریضہ ادا کر سکتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی احکام دو قسم کے عناصر سے مرکب ہیں۔

کچھ عناصر ثابت و مستقل ہیں جو ہر دور اور ہر زمانہ کے لئے یکساں طور پر بنائے گئے ہیں جیسے کہ وہ احکام جو قرآن و سنت میں مخصوص حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا تعلق اقتصادی زندگی سے ہے۔

اور کچھ عناصر متحرک قسم کے ہیں جن کے عمومی اصول و اشارات ثابت احکام میں بیان کر دیئے گئے ہیں اور ان کا انطباق حالات و کیفیت کو دیکھ کر کیا جائے گا۔ اور یہ عناصر ان تمام تغیرات و تطورات اعلاج کرتے رہیں گے جو آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔

اسلامی اقتصادیات کا نظام اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ثابت و مستقل عناصر کے ساتھ ان متغیر و متحرک عناصر کو شامل نہ کر لیا جائے جن کی بنیادیں ثابت عناصر ہی میں پائی جاتی ہیں اور دونوں ایک ہی ہدف و مقصد کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ متحرک عناصر کے اشارات و قواعد کو تلاش کر لینے کے لئے حسب ذیل امور پر توجہ دینی ہوگی اور ان کے بغیر کسی آدمی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ جب چاہے حالات کو دیکھ کر احکام الٰہیہ میں تغیر پیدا کر دے۔ یہ تغیر انسان کی خواہش و تمنا سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے قوانین اسلام کے مستقل احکام میں بیان کر دیئے گئے ہیں اور ان کے استخراج و استنباط کے حسبِ ذیل طریقے ہیں۔

۱۔ ثابت عناصر کو اسلامی منہج قرار دے کر ان کا بغور مطالعہ کیا جائے اور اس کے بعد ان کے اندر سے اشارات وعلامات کو تلاش کیا جائے کہ یہ عناصر غیر منصوص مقامات پر کس طرح کے احکام کا مطالبہ کرتے ہیں۔

۲۔ جس مرحلہ پر قانون کو منطبق کرنا ہے اس کا مکمل مطالعہ کیا جائے اس کے اقتصادی شرائط دیکھے جائیں اور ان مقاصد کا جائزہ لیا جائے جو اشارات کی روشنی میں واضح ہوتے ہیں اور ان طریقوں کو دیکھا جائے جو ان مقاصد کی تکمیل کر سکتے ہیں ان خصوصیات کے بغیر احکام کا استنباط جائز نہیں ہے۔

۳۔ حاکم شرع کی صلاحیت کے حدود کا قانونی اور فقہی جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ ان اختیارات وصلاحیت کے حدود میں رہ کر متحرک عناصر کی کیا شکل ہو سکتی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی اقتصادیات کا مکمل خاکہ ایک ایسا اہم کام ہے جس میں تمام اسلامی علماء ومفکرین کے تعاون کی ضرورت ہے اور سب کا فرض ہے کہ مل بیٹھ کر ایک مکمل نقشہ تیار کریں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یہ مفکر صاحب نظر مجتہد ہوں اور اقتصادیات کے جدید تقاضوں سے باخبر ہوں۔ اس کے بغیر نظام کا تشکیل دینا ناممکن نہیں ہے۔ رہ گئے وہ عمومی اشارات جو اسلامی اقتصادیات کے خاکہ کی تکمیل کرتے ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

عمومی اشارات

۱۔ شریعت کا رخ اور مقصد

اس اشاریہ کے معنی یہ ہیں کہ شریعت کے ثابت و مستحکم عناصر کے درمیان کتاب وسنت میں ایسے مختلف اقتصادی احکام پائے جاتے ہیں جن میں سب کا رخ ایک ہی سمت ہے اور سب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مشترک ہدف ہے جسے صاحبِ شریعت نے ثابت کرنا چاہا ہے اور اس کے تحفظ کی خاطر متحرک عناصر وضع کئے ہیں تا کہ ان کے ذریعہ بدلتے ہوئے حالات میں بھی مقصد حاصل کیا جا سکے یا اس کی بلندیوں تک سیر کی جا سکے۔

مثال کے طور پر شریعت میں حسبِ ذیل احکام پائے جاتے ہیں۔ جن کا مجموعی رخ ایک ہی ہدف اور ایک ہی مقصد کی طرف ہے۔

۱۔ اسلام نے طبیعی ثروتوں کے مصادر (کنواں، نہر وغیرہ) میں بھی شخصی ملکیت کو جائز اور روا رکھا ہے۔

۲۔ اسلام نے حمیٰ واحاطہ یعنی طبیعی ثروت پر صرف قبضہ وتسلط کی بنیاد پر بغیر کسی آبادکاری اور محنت کے کسی حق کے پیدا کر لینے کی ممانعت کر دی ہے اور ایسے حق کو لغو قرار دیا ہے۔

۳۔ اسلام کا قانون ہے کہ طبیعی مصدر صرف ہونے والے عمل کے آثار محو ہو جائیں اور جگہ اپنی حالت پر پلٹ آئے تو دوسرے ہر فرد کو حق ہے کہ جگہ کو ازسرِ نو زندہ کرے اور صالح مقاصد میں استعمال

کرے۔

۴۔ کسی طبیعی مرکز کی آبادکاری یا اس سے استفادہ اسے عمومی علاقہ کے حدود سے نکال کر خصوصی علاقہ میں داخل نہیں کرتا۔ فقط آبادکردہ زمین میں محنت کش کے لئے حق اولویت فراہم کرتا ہے۔

۵۔ سرمایہ دارانہ طریقہ پر دوسروں کو اُجرت اور آلات عمل دے کر ان کے ذریعہ آبادکاری سے کوئی حق پیدا نہیں ہوتا اور نہ کسی سرمایہ دار کو حق ہے کہ وہ پیداوار میں اپنا حق ثابت کرے اور مزدور کی محنت کے نتائج میں حصہ لگانے لگے جیسا کہ سرمایہ دارانہ معاشروں میں ہوتا ہے۔

۶۔ استخراجی صنعتوں میں بھی سرمایہ دارانہ طریقہ سے استخراج وجہ ملکیت نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر کوئی شخص مزدوروں کو اجرت دے کر اور آلات فراہم کر کے ان کے ذریعہ زمین سے تیل برآمد کرائے اور اس کے بعد تیل کو اپنی ملکیت سمجھ لے۔ ایسا نہیں ہو سکتا اور نہ اسلام نے سرمایہ دارانہ بنیادوں پر استخراج کو وجہ ملکیت سمجھا ہے۔

۷۔ تحویلی صنعتوں میں بھی جہاں ایک مال دوسری شکل میں تبدیل کیا جاتا ہے اگر آلات و اجرت دے کر مزدوروں سے کام لیا جائے تو وہاں مالک آلات ووسائل کو ثروت میں کوئی حق نہیں پیدا ہوتا۔ مثال کے طور پر چند آدمی مل کر دوسروں کی بنائی کی مشین لے کر اون بن لیں تو مشین کے مالک کا اون میں کوئی حق نہیں پیدا ہوتا۔ اسے صرف اپنی مشین کا کرایہ لینے کا حق ہے کہ اس کے آلات و وسائل سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۸۔ نقد سرمایہ اگر کسی معاملہ میں مضمون ہو یعنی اس کی ضمانت دے دی گئی ہو اور پھر وہ معاملہ میں لگا دیا جائے تو صاحب مال کو کسی طرح کے تصرف کا جواز نہیں ہے۔ یہ سود ہے اور اسلام میں حرام ہے۔ اس میں سرمایہ دار نے صرف اپنے مال سے استفادہ کرنے میں ایک مدت چھوڑ دی ہے یا اس مدت میں دوسرے کو استفادہ کرنے کا حق دے دیا ہے اور اس انداز سے محنت کے بغیر فائدہ کا جواز حاصل نہیں ہوگا۔ فائدہ کل مزدور کا ہوگا اگرچہ وہ بضاعت کا مالک نہیں تھا۔ ایسی صورت میں نقد سرمایہ کے ذریعہ فائدہ کمانے کا صرف ایک راستہ ہے کہ صاحب مال اپنے مال کو خطرے میں ڈالے اور سارا خطرہ اپنے ذمہ لے۔ مزدور پر کسی قسم کا بار نہ ڈالے (جسے زبان شریعت میں مضاربہ کہا جاتا ہے) یعنی ایک شخص دوسرے کو مال دے کر اس کے ذریعہ کاروبار کرائے اور یہ شرط رکھے کہ اگر مال ضائع ہوگیا تو تمام ذمہ داری صاحبِ مال پر ہوگی مزدور پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ اس صورت میں مالک مزدور کے ساتھ فائدہ میں شریک ہوسکتا ہے۔ سرمائے کی ضمانت کے ساتھ فائدہ حاصل کرنا سود اور حرام ہے (جوادی)۔

۹۔ کسی کرایہ دار کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی اجرت سے سرمایہ دارانہ فائدہ حاصل کرے اور اس سے بغیر محنت کے استفادہ کرے یعنی مکان یا دُکان وغیرہ کرایہ پر لے کر پھر اسے زیادہ کرایہ پر اٹھا دے اور خود اس میں کوئی محنت نہ کرے یہ عمل اسلام میں جائز نہیں ہے جس طرح کہ مزدور کو کرایہ پر لے کر دوسرے کے حوالے زیادہ کرایہ پر دینا کہ یہ بھی حرام اور ناجائز ہے۔

۱۰۔ قرض کے معاملہ میں مال پر حقیقی قبضہ دیئے بغیر کسی کا مقروض اور ذمہ دار کو قرض کر لینا جائز نہیں ہے۔ اسلام میں قرض کے لئے قبضہ شرط ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ نوٹ، چیک، ڈرافٹ وغیرہ کا وہ کاروبار جو سرمایہ دار ذہنوں کی ایجاد ہے اور جس نے دولت مند کو بغیر زحمت ومحنت کے مال بڑھانے کا سنہری موقع دیا ہے۔ شرعی اعتبار سے جائز نہیں ہے کہ اس طرح انسان اپنے حقیقی سرمایہ سے کہیں زیادہ فرضی کاغذات صادر کر دیتا ہے اور لوگوں کے قرض ادا کر دیتا ہے حالانکہ اس کے پاس اس قدر سرمایہ نہیں ہوتا۔ اور اس کا راز یہ ہے کہ تمام لوگ بیک وقت اپنے قرض کا مطالبہ نہیں کرتے اور ہر مقروض فقط کاغذات سے معاملہ کرتا ہے۔ ورنہ صاحب مال اپنا حقیقی فرض خزانہ سے نکال لے یا بینک سے الگ کر لے تو ایسے معاملات کا امکان ہی نہ رہ جائے گا اور قرض سے قبضہ کی شرط الگ کر دینے سے جو دولت کے اضافے کا امکان پیدا ہو گیا ہے وہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ مختصر یہ کہ قرضوں کی ادائیگی میں کریڈٹ لیٹر کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اصل رقم دینا ہے اور رقم کے ذریعہ کسی کٹائی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

ان سارے احکام کا ایک رخ اور ایک مقصد ہے کہ یہ سب مل کر اس معاملہ کا استیصال کر دینا چاہتے ہیں جس کی بنیاد عمل اور محنت پر نہ ہو اور استفادہ کے سرمایہ دارانہ طریقے کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دینا چاہتے ہیں جس سے اسلام کے متحرک عنصر کا ایک مستقل اشاریہ سامنے آجاتا ہے کہ جب بھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں۔ حاکم شرع کا فرض ہے کہ اپنے امکانیات واختیارات کی بناء پر ایسے معاملات پر پابندی عائد کر دے اور شرعی حدود کے اندر اس راستہ پر چلنے لگے بشرطیکہ کسی منزل پر ثابت عناصر سے ٹکراؤ نہ ہونے پائے۔

ب۔ حکم ثابت کا ہدفِ منصوص

اس اشاریہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر قرآن وسنت میں کسی ثابت حکم کی علت اور اس کا مقصد بیان کر دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دیگر مقامات پر جہاں جہاں وہ مقصد پایا جاتا ہے وہاں قانون کے سرایت کرنے کا امکان ہے اور مقصد کی صراحت اسلامی اقتصادیات کے متحرک عناصر کے خلاء کو پُر کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ بشرطیکہ وہ کم شرع کے اختیارات کے حدود کے اندر ہوں اور حالات و کیفیات کے پیش نظر ویسے ہی قانون وضع کئے جائیں جو اس مقصد کی تحصیل کے لئے کافی ہوں اور اس سے تجاوز نہ کیا جائے۔

مثال کے طور پر قرآنِ حکیم میں سورۂ حشر کی آیت ۷۔٦ ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے کہ

> اہل قریہ کی طرف سے جو کچھ اللہ نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو
> بغیر جنگ وجدل کے عنایت فرما دیا ہے وہ اللہ، رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)،
> صاحبان قرابت، ایتام، مساکین، مسافران غربت زدہ کے لئے ہے
> تا کہ دولت صرف اغنیاء کے درمیان چکر نہ لگاتی رہے۔ جو کچھ رسول
> (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہیں دے دیں اسے لے لو اور جس چیز سے منع کر دیں
> اس سے رک جاؤ۔ اللہ سے ڈرو اس کا عذاب بڑا سخت ہے۔

آیت شریفہ کا صاف اشارہ ہے کہ سماج میں توازن اور مال کا اس طرح منتشر ہو جانا کہ پورے معاشرے کی ضروریات کی تکمیل ہو سکے اور وہ چند آدمیوں کے ہاتھوں کا کھلونا نہ بن جائے۔ شریعت کا ایک بہترین مقصد ہے اور یہ مقصد متحرک عناصر کے لئے بہترین اشاریہ کا درجہ رکھتی ہے جس کے بعد حاکم شرع کو تمام شرعی قوانین وضع کرنے کا اختیار ہے جن سے تقسیم ثروت میں اجتماعی توازن برقرار ہو سکے اور ثروت چند آدمیوں کے درمیان محصور نہ ہونے پائے اس طرح حکومت اسلامی پیداوار کے سرمایہ دارانہ نظام اور ذخیرہ اندوزی کے تمام اشکال واقسام سے جنگ کر سکتی ہے اور اس کا خاتمہ کر سکتی ہے۔

دوسری مثال یہ ہے کہ زکواۃ کے روایات میں یہ بات صراحت کے ساتھ پائی

جاتی ہے کہ زکواۃ فقط فقیر کی ضروریات زندگی کے فراہم کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ اس کا منشاء یہ ہے کہ فقیر کو اس قدر مال دیا جائے کہ وہ معاشرہ کی عام سطح زندگی تک پہنچ جائے جو زندگی غیر فقیر افراد گزار رہے ہیں یعنی تمام افراد معاشرہ کے لئے ایک جیسی یا قریب قریب ایک جیسی سطح زندگی فراہم کی جائے۔ اور حاکمِ شرع کا فرض ہے کہ یہ اس راہ میں سعی کرے اور معاشرہ کے غرباء کو عام سطح زندگی تک لانے کا معقول بندوبست کرے۔

ج۔ وہ اجتماعی قدریں جنہیں اسلام نے اہمیت دی ہے

کتاب وسنت کے اسلامی احکام میں ایسی قدریں بہر حال پائی جاتی ہیں جن کو بے حد اہمیت دی گئی ہے اور ہر مقام پر ان کا لحاظ رکھا گیا ہے جیسے مساوات، اخوت، عدالت وغیرہ۔ جن سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اسلام ان قدروں کا تحفظ کرنا چاہتا ہے اور اس طرح اسلامی اقتصادیات کے متحرک عناصر کو ایک بنیاد ہاتھ آجاتی ہے کہ جہاں بھی عدالت ومساوات واخوت قائم کرنا پڑے۔ حاکمِ شرع کا فرض ہے کہ اس کے تقاضوں کے مطابق احکام وضع کرے۔ ارشاد ہوتا ہے:

> اے صاحبانِ ایمان عدل کے ساتھ قیام کرو اور خدا کے لئے گواہ بن جاؤ۔
>
> پیغمبر جب کوئی فیصلہ کرو تو عدل وانصاف کے ساتھ، اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔
>
> اللہ عدل، احسان اور ادائے حقوق ذوی القربیٰ کا حکم دیتا ہے۔
>
> ''مجھے بھی یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل و انصاف قائم کروں''۔
>
> ''اے انسانوں ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور مختلف قبائل اور اقوام میں تقسیم کر دیا ہے تا کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محترم وہ

ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ اللہ تمہارے حالات کو خوب جانتا ہے
اور تم سب سے باخبر ہو۔[1]

د۔ متحرک عناصر نبی اور امام کے ہاتھوں

اس اشاریہ کی تفصیل یہ ہے کہ بنی اور امام کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ وہ ایک طرف اسلام کے ثابت احکام کی تبلیغ کرتے ہیں اور دوسری طرف قائد و حاکم ہونے کی حیثیت سے ثابت احکام حاصل ہونے والے اشاریوں کی روشنی میں متحرک عناصر کی خانہ پری کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے دورِ حیات میں اقتصادی زندگی اور غیر اقتصادی زندگی کے مختلف خلاؤں کو ثابت احکام کی روشنی میں پُر کیا ہے اور چونکہ وہ صاحبِ رسالت یا وارثِ رسالت تھے اور عصمت کے درجہ پر فائز تھے لہٰذا ان کے اعمال یقینا اسلامی اقتصادیات کی روح کے حامل تھے اور واقعی زندگی کی ترجمانی کرتے تھے ان کا عمل دلیل محکم ہے اور حاکمِ شرع کا فرض ہے کہ ان کے عمل کو ایک اسلامی اشاریہ قرار دے کر بنیادِ احکام بنائے بشرطیکہ اس عمل کے حالات عصری حالات سے مختلف نہ ہوں ورنہ اسے نمونہ بنانا مشکل ہو جائے گا۔

یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ معصومینؑ کے ارشادات میں جہاں اسلامی قدروں کا اعلان ہوا ہے وہیں مختلف اجتماعی اور اقتصادی حالات کی تفسیر وتحدید بھی موجود ہے جس کی روشنی میں متحرک عناصر کی تحدید کی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر امیر المومنینؑ نے فقر کا مفہوم یوں بیان فرمایا

''کوئی فقیر بھوکا نہیں ہوتا جب تک کوئی غنی لطفِ حیات جمع نہ کر لے''۔

دوسرے مقام پر تاجر کا مفہوم بیان کرتے ہوئے تجارتی فائدہ کی تشریح مالک اشتر کے فرمان میں یوں فرمائی ہے کہ تاجر کو صنعت کار کے ساتھ جمع کر کے دونوں کی اقتصادی حیثیت کو یکساں قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ اقتصادی زندگی کا قیام تاجر اور صنعت کاروں سے ہے کہ وہ مختلف اشیا کو ان کے مراکز سے جمع کرتے ہیں۔ بازار میں فراہم

---

[1] سورۂ حجرات: ۱۴

کرتے ہیں اور اپنے ہاتھوں سے لوگوں کے لئے وہ سہولتیں اکٹھا کر دیتے ہیں جب تک دوسروں کا ہاتھ نہیں پہنچتا۔ یا ایک دوسرے مقام پر فرمایا ''یہ لوگ منافع کے مرکز اور اسے دور دور سے جمع کرنے والے بحر و بر اور سہل وجبل سے فراہم کرنے والے اور جن جگہوں سے لوگ مانوس نہیں ہیں اور جہاں تک جانے کی جرأت نہیں کرتے وہاں سے حاصل کرنے والے ہیں۔جس کا مطلب یہ ہے کہ امام کی نظر میں تاجر بھی صنعت کار کی طرح پیدا کرنے والا ہے اور اقتصادی اعتبار سے اس کے منافع کی توجیہ تمام وہ اعمال ہیں جو سامان فراہم کرنے ،اسے محفوظ رکھنے کی راہ میں انجام دیئے جاتے ہیں اور اس طرح ان منافع کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا جو سرمایہ دار اپنے انداز سے حاصل کرتے ہیں۔

اس اشاریہ کی چند مثالیں ذیل میں نقل کی جارہی ہیں۔

ا۔ مختلف روایات میں وارد ہوا ہے کہ مرسل اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مخصوص مدت کے لئے زمین کو کرایہ پر دینے کی ممانعت کر دی تھی اور یہ اعلان فرمایا تھا کہ جس کے پاس کوئی زمین ہے وہ زراعت کرے یا اپنے بھائی کو زراعت کے لئے دے دے۔تہائی چوتھائی یا معین مقدار طعام کرایہ پر دینے کا حق نہیں ہے۔

دوسری روایت کا مضمون ہے کہ جس کے پاس کوئی زمین ہے وہ خود زراعت کرے یا اپنے بھائی کو عطا کر دے اور اگر انکار کرے تو اس کی زمین پر قبضہ کر لیا جائے۔

تیسری روایات میں جابر بن عبداللہ انصاری نے یہ ارشاد نبوی نقل کیا ہے کہ جس کے پاس کوئی زمین ہے وہ خود زراعت کرے اور نہ کر سکے تو اپنے بھائی کو عطا کر دے اور خبر دار کرایہ پر نہ دے۔

ظاہر ہے کہ اسلام کے فقہی تمدنی قانون کی بناء پر اجارہ ایک جائز معاملہ ہے جس کی صراحتاً اجازت دی گئی ہے لیکن ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں مرسل اعظم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حاکم شرع کے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے اس حق کو روک دیا تھا۔ تاکہ اجتماعی توازن برقرار رہے اور بغیر عمل ومحنت کے دولت جمع کرنے کا رجحان ختم ہوجائے

جب کہ مدینہ کا نصف معاشرہ یعنی مہاجرین مختلف طرح کی معاشی زحمتوں میں زندگی گزار رہے تھے۔

۲۔ مختلف روایات میں وارد ہوا ہے کہ پیغمبر اسلام نے اپنی ضرورت سے زیادہ پانی اور گھاس کے دوسرے لوگوں کے استعمال سے روکنے کی ممانعت فرمادی تھی اور بقول امام صادق علیہ السلام

''پیغمبر اسلام'' نے اہلِ مدینہ کے درمیان یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ پانی اور گھاس ضرورت سے زیادہ ہے تو مالک کو دوسروں کو روکنے کا حق نہیں ہے''۔

ظاہر ہے یہ ممانعت سرکار نے بحیثیت حاکم شرع استعمال کی تھی جہاں منشا یہ تھا کہ مدینہ کا معاشرہ زراعت کی ترقی اور حیوانات کی پرورش کا شدت سے محتاج ہے اور اس کے لئے ایسے مواد کا فراہم ہونا سخت ضروری ہے جس سے یہ امور انجام دیئے جا سکیں۔ اب اگر اضافہ پانی اور گھاس کے دوسروں کے لئے مباح نہیں کیا جائے تو یہ معاشرہ تباہ ہو جائے گا۔ لہٰذا آپ نے اپنے حکومتی اختیارات کو استعمال کر کے مالکین کو منع کرنے سے روک دیا۔

۳۔ مالک اشتر کے نام فرمان میں امیر المومنین علیہ السلام نے اس بات کی شدت سے تاکید کی تھی کہ دو قسم کے احتکار اور ذخیرہ اندوزی پر پابندی لگائی جائے اور اس رجحان کو بالکل ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ آپ نے تجار اور اُن کے کاروبار کے بارے میں تحریر فرمایا کہ ''مالک یاد رکھو ان تجار میں بعض لوگوں میں واضح تنگی اور قبیح بخل پایا جاتا ہے۔ یہ منافع کا ذخیرہ کرتے ہیں۔ تجار قوم پر تسلط کر لیتے ہیں جو عمومی فائدہ کے حق میں مضر اور والیٔ مملکت کے لئے عیب ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کو ذخیرہ اندوزی سے منع کر دو کہ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسے ممنوع قرار دیا ہے۔ تجارت سہل، آسان اور عدل و انصاف کے مطابق ہونی چاہیے۔ کوئی قیمت ایسی نہ ہو جو خریدار یا بائع کے حق میں مضر ہو۔

ظاہر ہے کہ امام کی طرف سے یہ سخت ممانعت اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام ان

منافع کو پسند کرتا ہے جو سرمایہ دارانہ ذخیرہ اندوزی سے پیدا ہونے والی فرضی قیمتوں کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ جنس اپنی واقعی متبادل قیمت پر باقی رہے جو جنس کی حقیقی منفعت اور اس کی طبعی افادیت سے پیدا ہوتی ہے اور اس میں فرضی ندرت کا دخل نہیں ہوتا جو تجار اور سرمایہ دار رسد وطلب کے معاملات پر غلبہ حاصل کر کے پیدا کر دیا کرتے ہیں۔

۴۔ امیر المومنین علیہ السلام کی سیرت میں یہ بات بھی پائی جاتی ہے کہ آپؑ نے زکواۃ کی معینہ اشیا کے علاوہ بھی بعض چیزوں میں زکواۃ کے فرض ہونے کا اعلان کیا تھا اور ۹ معینہ اجناس کے علاوہ آپ نے اپنے دورِ حکومت میں گھوڑے کی زکواۃ بھی واجب کر دی تھی جس کا مقصد یہ ہے کہ زکواۃ اسلامی نقطۂ نظر سے کسی مخصوص مال سے مختص نہیں ہے بلکہ حالات زمانہ کے تحت ولی امر کو اختیار ہے کہ وہ اس کے دائرہ میں وسعت پیدا کر دے اور مقصدِ زکواۃ کو حاصل کرے۔ [۱]

مقاصد ولی امر

اس اشاریہ کا مفہوم یہ ہے کہ شریعت اسلام نے ولی امر اور حاکم شرع کے لئے کچھ مقاصد اور فرائض طے کر دیئے ہیں جن کی ایجاد و تحصیل اس کا فرض ہے جس سے اسلام کی اقتصادی سیاست کا نقشہ تیار ہوتا ہے اسلامی اقتصادیات کے متحرک عناصر کا اشاریہ تیار ہوتا ہے کہ حاکم شرع کو ان تمام اقدامات کا حق ہے جن سے ان مقاصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے جس کی ذمہ داری اس کے سر ڈالی گئی ہے۔ مثال کے طور پر امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام نے زکواۃ کے بارے میں فرمایا کہ

> ولی کا فرض ہے کہ وہ مال زکواۃ کو جمع کر کے اُن آٹھ وجوہ میں
> صرف کرے جنہیں قرآن حکیم نے معین فرمایا ہے اور زکواۃ فقرا و

---

[۱] واضح رہے کہ اس قانون میں مخصوص موارد کی مخالفت شامل نہیں ہے کہ وہ ''اولی الامر'' اسلامی احکام کو منسوخ کرنے کا ارادہ کرے۔ (جوادی)

مساکین کی ضرورت سے کم پڑ جائے تو اپنے پاس سے پورا کرے۔

ظاہر ہے کہ اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ حاکم شرع پر بہرحال اس امر کی ذمہ داری ہے کہ غربا و مساکین کا انتظام کرے چاہے اپنے پاس سے ہو۔ اس میں صرف مال زکواۃ کی تقسیم کا سوال نہیں ہے گویا اس مقام پر ایک ثابت حکم ہے کہ حاکم شرع کو معاشرہ کے فقر و فاقہ کا علاج کرنا ہے اور اس راہ میں ہر امکانی کوشش کرنا ہے تا کہ فقیر بھی سماج کی ادنیٰ حد معیشت تک پہنچ جائے اور یہ ثابت حکم ایک متحرک عنصر کیلئے اشاریہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ جب سماج کے حالات خراب ہو جائیں اور زکواۃ کا مال کم پڑ جائے تو حاکم شرع کا فرض ہے کہ کہیں نہ کہیں سے اس کمی کو پورا کرے اور یہ اس کے اختیارات کی توسیع کا اعلان ہے۔

اسلامی معاشرہ میں اقتصادیات کی مکمل تصویر وہی صورت ہے جس میں ثابت عناصر کے ساتھ متحرک عناصر بھی پائے جاتے ہوں اور دونوں مل کر زمین خدا پر عدل وانصاف قائم کریں۔ یہ چند اوراق اسی خاکہ کی تشکیل کے سلسلہ میں سپرد قلم کئے گئے ہیں جن میں اسلامی اقتصادیات کے ثابت عناصر کا بھی تذکرہ ہے اور ان مقاصد کا بھی تذکرہ ہے جن سے متحرک عناصر کے اشاریہ مرتب ہوتے ہیں جن کی روشنی میں اسلامی معاشرہ کے اقتصادیات کے تمام اہم خطوط ان دفعات میں مرتب کئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ اسلامی اقتصادیات کا ایمان ہے کہ طبیعی مصادر ثروت کا مالک پروردگار ہے اور انسان کوئی بھی حق خاص عمل اور محنت کے بغیر حاصل نہیں کر سکتا۔

۲۔ اسلامی اقتصادیات کا ایمان ہے کہ طبیعی ثروت سے بھی بشری استفادہ اس شخص کو ثروت کا مالک بنا سکتا ہے جو براہِ راست محنت کرے۔ آلات پیداوار انسان کے خادم ہیں ان کا پیداوار میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

۳۔ اسلامی اقتصادیات کا عقیدہ ہے کہ حکومت کو اس بات کی

مسلسل کوشش کرنا چاہیے کہ پیداوار کو محنت سے مربوط بنائے رکھے اور دھیرے دھیرے ان تمام طریقوں کا قلع قمع کردے جن میں پیداوار اور محنت میں کوئی ربط نہیں ہے اور یہ واضح کردے کہ جیسے جیسے مالک اپنے اموال کو خطرہ میں ڈالنے سے پرہیز کرے گا ویسے ویسے اس کے منافع کی مقدار کم ہوتی جائے گی۔ سرمایہ دارانہ انداز سے منافع خوری اسلام میں جائز نہیں ہے۔

۴۔ اسلامی قانون ہے کہ حکومت کو پورے سماج کے لئے ایک یا ایک جیسی سطح زندگی فراہم کرنا چاہیے اور اس کا راستہ یہ ہونا چاہیے کہ غریبوں کی سطح زندگی بلند کی جائے اور امیروں کو اسراف اور تبذیر سے روک دیا جائے۔

۵۔ اسلامی اقتصادیات کا قانون ہے کہ حکومت کو معاشرہ کے اجتماعی توازن کو برقرار رکھنے کے لئے اموال کی ذخیرہ اندوزی اور جمع آوری کی راہ میں حائل ہو جانا چاہیے اور ایسے اعمال کی سخت روک تھام کرنا چاہیے۔

۶۔ اسلامی اقتصادیات میں حکومت کا فرض ہے کہ اقتصادیات کا مکمل خاکہ بروئے کار لانے کے لئے سکہ کو اس کی واقعی حیثیت پر واپس لاکر اسے تبادلہ کا ذریعہ بنائے اور سود خوری، ذخیرہ اندوزی وغیرہ کے ذریعہ اسے دولت کمانے کا ذریعہ نہ بننے دے۔ ذخیروں پر ٹیکس عائد کرے اور جن سرمایہ دارانہ طریقوں کی روک تھام ممکن ہو انہیں روک دے جنہیں لوگ پیداوار اور مصرف کے درمیان طفیلی بن کر بازار کو خراب کر دیتے ہیں اور ایسے اعمال انجام دیتے ہیں جن سے فرضی ندرت عالم وجود میں آجائے اور جنس کی

قیمت بڑھ جائے۔

۷۔ حکومت کا فرض ہے کہ بینک کے نظام کو سرمایہ دارانہ اضافہ اموال کے بجائے تمام امت کو دولت مند بنانے کی راہ میں مرتب کرے اور متفرق اموال کو جمع کرنے میں تمام امت کو حصہ دار بنائے اور پھر جب پیداواری اعمال سے فائدہ ہو تو اس فائدہ کو مضاربہ (حصہ فیصدی) کی بنیاد پر تمام مالکوں کے درمیان تقسیم کر دے۔

۸۔ حکومت کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ عمومی علاقوں میں عمل کرنے کے مواقع تمام افراد معاشرہ کے لئے فراہم کرے اور جو عمل کرنے کے قابل نہ ہوں ان کی معیشت کا سامان کرے۔ زکواۃ جمع کرے تا کہ سماج میں ان افراد کو زندگی کی ضمانت دے سکے اور تیل وغیرہ کا پانچواں حصہ اس ضمانت کے لئے مخصوص کر دے اور اپنے مخصوص نظام کے تحت لوگوں کے لئے مکان کا انتظام کرے۔

۹۔ حکومت کا یہ بھی فرض ہے کہ عمومی علاقوں کی آمدنی سے تعلیم کو مفت کر دے۔ صحت عام کا انتظام مفت کرے تا کہ ملک کا ہر باشندہ تعلیم و صحت کے انتظامات سے بلا کسی معاوضہ کے فائدہ اٹھا سکے اور سماج میں کوئی شخص جاہل یا بے علاج نہ رہ جائے۔

یہ اسلامی معاشرہ کے اقتصادیات کا ایک اجمالی خاکہ ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی معاشرہ میں زندگی گزارنے والا شخص جاہل رہ سکتا ہے نہ بے علاج ودوا۔ یہاں نہ سرمایہ دارانہ منافع خوری کا گزر ہے نہ اشتراکی ظلم وستم کا۔ یہ ایک سیدھا سادہ الٰہی نظام ہے جس کا مقصد بندوں کو زندگی کا مکمل انتظام کرنا اور انسانی اعلیٰ اقدار وافکار کا مکمل تحفظ کرنا ہے۔ اس کے بعد تفصیلات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔

''اے ایمان والو! جب خدا و رسول تمہیں پیغام زندگی دیں تو اسے قبول کرلو اور یاد رکھو کہ خدا انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہوجاتا ہے اور تمہیں اس کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔

اس موقع کو یاد کرو جب تم تھوڑی تعداد میں روئے زمین پر کمزور و ناتواں تھے۔ ہر آن یہ خطرہ تھا کہ کب کون تمہیں دبوچ لے۔ اللہ نے تمہیں بچایا اور تمہاری مدد کی تمہیں طیب رزق عطا فرمایا کہ شاید تم اس طرح اس کے شکر گزار بندے بن جاؤ۔ [۱]

۞ ۞ ۞ ۞ ۞

[۱] سورۂ انفال: ۲۶

﴿۳﴾

اسلامی معاشرے کی اقتصادیات

﴿۳﴾

اسلامی معاشرے کی اقتصادیات

اسلامی مکتب فکر کی گذشتہ کڑی میں انسان کی جس عمومی خلافت و نیابت کا ذکر کیا گیا تھا۔ اس کا تقاضا یہ تھا کہ انسان خالق کائنات کو کل کائنات اور اس کی ثروتوں کا مالک تسلیم کرے اور یہ اقرار کرے کہ اس نے انسان کو اپنی ملکیت پر تصرف کرنے کے لئے اپنا نائب خلیفہ قرار دیا ہے۔ وہ ذاتی طور پر کسی شے کا مالک نہیں ہے اس کے لئے یہی شرف بہت کافی ہے کہ اسے پروردگار نے نیابت و خلافت کا مرتبہ عنایت کیا ہے اور اس طرح اس کے احساس ذمہ داری و امانتداری پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ انسان تنہا وہ مخلوق ہے جس میں مسئولیت کا احساس پایا جاتا ہے اور اسی لئے اسے خلافت کا شرف دیا گیا ہے تاکہ وہ اس کائنات میں امانتداری کے تقاضوں کے مطابق اور امر الٰہیہ کی روشنی میں تصرف کرے۔

اسلام میں ثروت کے احکام بھی اوامر الٰہیہ کی ترجمانی کرتے ہیں جس کے ذریعہ انسان کی امانت داری کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ خلافت کے قوانین کی کس قدر پابندی کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اسلام میں یہ احکام دو طرح کے ہیں۔ بعض احکام اسلام کی مکمل شکل کی آئینہ داری کرتے ہیں اور بعض سے اسلام کے ایک محدود خاکہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

مکمل صورت وہ ہے جس میں اسلام کے احکام اس معاشرہ کو پیش نظر رکھ کر پیش کئے گئے ہیں جس کی اساس اسلامی قوانین پر ہے اور جس کے اقتصادیات کی عمارت آسمانی شریعت کی روشنی میں کھڑی کی گئی ہے اور محدود صورت وہ ہے جہاں معاشرہ اسلامی نہ ہو اور ایک فرد اپنے سماجی تعلقات کو اسلامی بنیادوں پر قائم کرے۔ مکمل اجتماعی نظام غیر اسلامی

نظریات پر چل رہا ہے اور مسلمان اپنے ذاتی سلوک اور اجتماعی تعلقات میں اسلام کی پابندی کرنا چاہتا ہے۔

ظاہر ہے اس شکل میں اسلام کی مکمل صورت سامنے نہ آ سکے گی اور وہ سارے قوانین ہی پیش نہیں کئے جا سکتے جو اقتصادی خلافت کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔

دونوں صورتوں کا فرق حسبِ ذیل باتوں سے ظاہر ہو سکتا ہے۔

۱۔ اسلامی شریعت کے مستقل قوانین میں بہت سے احکام ایسے ہیں جو فرد کی طاقت سے بالاتر ہیں اور ان کا خطاب سماج اور معاشرہ ہی سے کیا جا سکتا ہے جن کا اس محدود صورتحال میں کوئی عمل و موقع نہیں ہے۔ جہاں فقط فرد کے ذاتی یا سماجی سلوک کی تجدید کی جاتی ہے اور معاشرہ کو اجنبی فرض کر لیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ احکام اسلامی اقتصادی خاکہ کا بنیادی جز رہی ہیں۔ جس طرح کہ اسلامی معاشرہ میں اجتماعی توازن قائم کرنے کا مسئلہ ہے کہ یہ ایک فریضہ ہے لیکن اس کا تعلق اس قیادت سے ہے جو اسلامی معاشرہ کی نگرانی کر رہی ہے۔ دوسری قیادتوں کے زیرِ سایہ اس قانون کا کوئی محل نہیں رہ جاتا اور نہ اس کا تعلق افراد کے ذاتی سلوک سے کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ اسلام کے عمومی اشارات جو اسلامی اقتصادیات کے متحرک عناصر کی نشاندہی کرتے ہیں اور جن کا اسلام کی مکمل تصویر میں بڑی حد تک دخل ہے۔ افرادی سلوک میں کوئی کام انجام نہیں دے سکتے اور نہ ان سے کوئی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ان ارشادات کا تعلق ان طریقہ ہائے کار سے ہے جن میں ولی امر اور حاکم شرع اپنی قیادتی صلاحیتوں کی بنا پر معین کرتا ہے اور ان ہی کی روشنی میں معاشرہ کو چلاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ معاشرہ غیر اسلامی ہوگا اور معاملہ صرف افراد کے سلوک کا ہوگا تو ان ارشادات کی کوئی حیثیت نہ رہ جائے گی۔ مثال کے طور پر اسلام نے ذخیرہ اندوزی کے بڑھتے ہوئے رجحان کو دیکھتے ہوئے حاکمِ شرع کو اختیار دیا ہے کہ وہ قیمتوں کے اضافہ کی راہ میں حائل ہو جائے اور بڑے بڑے ثروت مندوں کو فرضی کمی دکھا کر قیمتوں میں اضافہ

کے مواقع فراہم کرنے دے۔ یہ بات اسلامی اقتصادیات میں ایک بڑا اہم رول ادا کرتی ہے لیکن اس کا کوئی تعلق افراد کے شخصی سلوک سے نہیں ہے اور نہ اس کے بغیر اقتصادیات کی شکل میں پیش کی جاسکتی ہے۔

۳۔ غیر اسلامی معاشرہ میں ایک متدین انسان کی زندگی ہمہ وقت ایک تضاد اور تناقص کا شکار رہتی ہے اور وہ ایک مستقل ذہنی کشمکش کا شکار رہتا ہے۔ ایک طرف شرعی احکام ہوتے ہیں اور ایک طرف وہ ضرورتیں جن کا معاشرہ میں کوئی بدل نہیں ہے اور نہ ان میں کوئی تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ ایسی صورت میں شریعت زندگی گزارنے کے لئے استثنائی قوانین معین کردیتی ہے اور پریشان حال انسان کی مشکل حل کردیتی ہے لیکن اس کا کوئی تعلق اسلام کے واقعی احکام سے نہیں ہوتا اور نہ اس کی روشنی میں اسلام کا خاکہ تیار کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر غیر اسلامی معاشرہ کے سودی بینک ہیں کہ اسلام نے مرد متدین کو اپنے جمع کئے ہوئے اموال پر فائدہ لینے کا اختیار یہ کہہ کر دے دیا ہے کہ یہ اموال مجہول [1] المالک ہیں اور مجہول المالک مال پر حاکم شرع کی اجازت سے تصرف ہوسکتا ہے لیکن یہ بات اسلامی اقتصادیات کے عام مزاج کے خلاف ہے اور یہی وجہ ہے کہ اگر معاشرہ اسلامی ہوجائے تو اس طرح کا ہر فائدہ حرام ہوجائے گا اور بینک سے استفادہ کرنے کا حق انہیں افراد کو ہوگا جو محنت اور عمل میں شرکت رکھتے ہوں۔

رسائل علمیہ میں عام طور سے اسلام کا محدود خاکہ پیش کیا جاتا ہے جہاں ایک مرد متدین غیر اسلامی معاشرہ میں رہ کر بھی اسلام کے قوانین پر عمل کرنا چاہتا ہے اور یہی وجہ

---

[1] اسلام نے بینک کے اموال کو مجہول المالک قرار دیا ہے کہ بینک کے پاس سینکڑوں کھاتہ داروں کا مال ہے اور کسی مال (نوٹ) کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ نوٹ کس کا ہے جو بینک ملکیت کا دعویٰ نہیں کرسکتا اس لئے کہ اس نے مال بطور امانت لیا ہے اور امانتدار مالک نہیں ہوتا۔ اب مال مجہول المالک میں مال کی شناخت اور مالک کی جستجو ممکن ہوتی تو مال اس کے حوالے کیا جاتا اور یہ ممکن نہیں ہے تو حاکمِ شرع کی اجازت سے تصرف کیا جائیگا۔ اور کوئی شرعی اشکال نہ ہوگا۔ فرق صرف یہ ہے کہ بینک سمجھے گا کہ یہ نہ قرض ہے نہ سود۔ ایک مجہول المالک رقم ہے جسے حاکم شرع کی اجازت سے اس کی نیابت سے وصول کیا ہے جسے نہ قرض کہہ سکتے ہیں نہ سود۔ اسی لئے سودی بینک کا قرض بھی جائز ہے اور سود بھی کہ وہ واقعتاً نہ قرض ہے نہ سود۔ جوادی

ہے کہ ان رسائل سے اسلامی اقتصادیات کی صحیح شکل منظر عام پر نہیں آسکتی اور نہ ان سے وہ نتائج حاصل ہو سکتے ہیں جن کی امید کی جاتی ہے مگر ان سب باتوں کے باوجود ان رسائل کا وجود ضروری ہے اور ان کے حسبِ ذیل مقاصد ہیں:

۱۔ مردِ متدین کو اطاعت پروردگار کا طریقہ معلوم ہو جائے اور وہ اپنی ذاتی زندگی میں اپنے فرائض کو ادا کرے۔

۲۔ مردِ متدین اپنی ذاتی زندگی اس احتیاط کے ساتھ گزارے کہ اس کی زندگی خود اس کے ایمان کی علامت بن جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ یہ آسمانی پیغام ہی کو زندگی کا صحیح راستہ سمجھتا ہے اور کسی دوسرے نظام کا قائل نہیں ہے۔

۳۔ اجتماعی عدالت کا کم سے کم وہ حصہ منظر عام پر آجائے جو ایک مردِ متدین کے اختیار میں ہے جیسا کہ قانون زکواۃ وخمس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان قوانین کو پروردگار عالم نے اجتماعی کفالت اور فقرا و مساکین کی عام نگرانی کے لئے وضع کیا تھا اور متدین افراد آج بھی ان احکام پر عمل کر کے حتی الامکان فقراء کی طرف سے وارد ہونے والی مسئولیت سے عہدہ برآ ہونا چاہتے ہیں حالانکہ ان کے اوپر حکومتی ٹیکسوں کا بوجھ بھی ہوتا ہے اور وہ ان سب کو برداشت کر کے اسلام کی اجتماعی کفالت کا ایک محدود خاکہ پیش کر دیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ محدود خاکہ اس تفصیلی خاکہ سے بے نیاز نہیں بنا سکتا جو اس سماج میں منظر عام پر آسکتا ہے جس کی بنیادیں اسلام پر استوار ہوں اور جس کی تشکیل اسلامی قوانین کی روشنی میں ہوئی ہو۔

تفصیلی خاکہ کے عناصر

اس سوال کا جواب دینے کے لئے ''اسلامی اقتصادیات کے تفصیلی خاکہ کے اجزاء وعناصر کیا ہیں؟'' ہمیں پہلے ان تعلقات کا جائزہ لینا پڑے گا جس سے ہر انسان کو معاشی زندگی میں دو چار ہونا پڑتا ہے۔ یاد رکھئے کہ معاشی زندگی میں انسان دو طرح کے تعلقات [1] سے دو چار ہوتا ہے۔

۱۔ انسان کا ایک تعلق طبیعت کائنات سے ہوتا ہے جہاں وہ عمل ومحنت کے ذریعہ اس پر قابو پا کر اس کے خیرات و برکات سے استفادہ کرتا ہے۔ اس تعلق کا نام پیداوار ہے جس کی تاریخ میں مختلف شکلیں رہتی ہیں۔ معمولی پتھر، دس کدال، ہوڑی چکی سے لے کر بخاری آلات اور برقی مشینوں تک ساری صورتیں پیداوار ہی کی شکلیں ہیں جو طبیعت کائنات سے انسان کے تعلقات کی تعبیر کرتی ہیں کہ انسان نے کس دور میں کائنات سے کیا رشتہ رکھا ہے اور کس طرح اس سے استفادہ کیا ہے۔

۲۔ دوسرا تعلق انسان کا انسان کے ساتھ ہے جہاں دونوں فطرت کی برکتوں سے استفادہ کرنے کا حق رکھتے ہیں اور اس کے اظہار تقسیم ثروت کی مختلف شکلوں میں کرتے ہیں۔ غلامی، جاگیرداری، سرمایہ داری، اشتراکیت اور اسلامی نظام اقتصادیہ سب اسی تعلق کی مختلف شکلیں ہیں کہ انسان نے طبیعت کے خیرات کو آپس میں کن بنیادوں پر تقسیم کیا ہے۔

مارکسیت نے اس مقام پر ایک عظیم غلطی یہ کی ہے کہ اس نے تقسیم کے وسائل کو

---

[1] معاشی زندگی کے دو بنیادی مسائل ہیں ایک پیدوار جس کا تعلق تسخیر کائنات سے ہوتا ہے اور اس میں انسان اور کائنات کا تعلق دیکھا جاتا ہے اور ایک تقسیم ثروت جس کا تعلق پیدا کردہ دولت وثروت سے ہوتا ہے اور جس میں انسان کے باہمی تعلقات دیکھے جاتے ہیں کہ اس ثروت کو کن تعلقات کی بنیاد پر تقسیم کیا جائے۔ سماج کا باہمی رشتہ غلامی اور آقائی کو قرار دیا جائے یا کاشتکاری اور جاگیرداری کو۔ مارکسیت کا خیال ہے کہ پیداوار کی ہر سطح خود سماج کا ایک نظام پیدا کرتی ہے اس کے لئے الگ سے کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ تقسیم کی منزل میں ہر نظام مجبور اور بے بس ہے، تقسیم پیداوار کی کیفیت سے پیدا ہوتی ہے اور اسلام کا نظریہ ہی یہ ہے کہ دونوں الگ الگ ہیں اور تقسیم کو حق و انصاف کا تابع ہونا چاہئے، پیداوار کسی منزل پہ ہو اور اس کی کوئی صورت حال ہو۔ جوادی

تمام تر پیداوار سے وابستہ کر دیا ہے اور اس کا خیال یہ ہے کہ تقسیم پیداوار بھی عمارت کی دوسری منزل کا نام ہے جس کا تمام تر دارومدار پہلی منزل پر ہے۔ پیداواری کیفیت سے ایک تقسیمی تعلق پیدا ہوتا ہے اور ہر پیداوار کی سطح ارتقاء و منزل ایک مخصوص نظام تقسیم کو جنم دیتی ہے یہاں تک کہ جن تقسیم کی اجتماعی شکل پیداوار کی ترقی یافتہ شکل کا ساتھ نہیں دے پاتی اور اس کی راہ میں رکاوٹ بننے لگتی ہے تو پیداوار کی ترقی یافتہ شکل خود بخود تقسیم کا ایک نیا نظام پیدا کر دیتی ہے جس سے پیداوار کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔

اس نظریئے کی بناء پر تقسیم کا نظام انسان کے ہاتھ میں نہیں ہے اور نہ اسے اس سلسلے میں مداخلت کرنے کا حق ہے۔ یہ تمام تر پیداوار کا حق ہے وہ جب تک نظام تقسیم کو اپنے تقاضوں کے مطابق دیکھے گا اسے برقرار رکھے گی اور جب اپنی راہ میں رکاوٹ سمجھے گی تبدیلی پیدا کر دے گی جو مادیت تاریخ کا حتمی نتیجہ ہے۔ اس فلسفہ کی بناء پر غلامی بھی ایک تاریخی ضرورت ہے جسے پیداوار کے اس مرحلے میں ہونا چاہیے تھا جس مرحلہ پر اس کا وجود ہوا تھا اور وہ پیداوار کی ضرورت کو پورا کر رہی تھی۔

لیکن اسلام اس کے بالکل برعکس نظریہ کا حامل ہے۔ اس کی نظر میں پیداوار کے مصالح نظام تقسیم کا تعین نہیں کر سکتے اور نظام تقسیم کو انسانی اور ربانی اقدار و افکار کی روشنی میں طے کرنا ہوگا جو انسانی خلافت و نیابت کا خاصہ ہے اور جس سے انسان کے حق و عدل و مساوات و کرامت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ظلم و استحصال کی بنیاد پر قائم ہونے والے نظام تقسیم کو قطعی طور پر غلط قرار دیا ہے چاہے پیداوار کی شکل کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ان ظالمانہ رشتوں کو فقط نظریات کی حد تک ناپسند نہیں کرتا بلکہ اس نے عملی طور پر بھی انہیں مہمل قرار دیا ہے اور اس دور میں مہمل قرار دیا ہے جب ان کے غلط قرار دینے کا مارکسی نظریات کی روشنی میں کوئی امکان نہ تھا اور پیداوار ایسے ہی حالات کا تقاضا کر رہی تھی۔

اسلام کا نفاذ اور اس کا تاریخی انطباق، تاریخی مادیت اور مارکسی فلسفہ کے لئے ایک کھلا ہوا چیلنج ہے کہ مارکسیت کی نگاہ میں تقسیم کا نظام پیداوار سے الگ نہیں ہو سکتا اور اسلام

پیداوار کی کمزور ترین شکل میں بھی تقسیم کے کمترین نظام (غلامی) کو لغو اور مہمل قرار دیتا ہے۔

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ پیداوار کو فطرت کے بارے میں انسانی معلومات اور اس کی علمی ترقی کا تابع ہونا چاہیے اور جیسے جیسے انسانی معلومات میں اضافہ ہو اس کی شکل کو بدل جانا چاہیے اور انسان کو جدید ترین آلات و وسائل کے ذریعے فطرت کے خیرات و برکات سے مزید استفادہ کرنا چاہیے۔ اس کا کوئی تعلق تقسیم ثروت کے معاملات سے نہیں ہے۔

تقسیم ثروت کے تعلقات اسلامی نقطۂ نگاہ سے انسانیت کے ثابت و مستحکم اور حقوق انسان کی خلافت ارضی کی بنیاد پر قائم ہونے چاہئیں۔ اس کے لئے کوئی ضروری نہیں ہے کہ جیسے جیسے تسخیر کائنات کے وسائل بڑھتے جائیں تقسیم کے نظام میں بھی تغیر ہوتا رہے۔ مثال کے طور پر اسلام نے ملکیت و محنت میں ایک رابطہ قائم کیا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ اسلامی اضافی نسبتی اور وقتی قرار دے کر پیداوار کے مواقع زائل کرنے کی ضرورت نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ بنیادیں ہر حال میں برقرار رہیں گی اور پیداوار کی ہر شکل کے ساتھ قائم رہیں گی۔ اسلام کا اندازِ فکر مارکسیت جیسا نہیں ہے جہاں ملکیت کی تقسیم ایک پیداوار کی ضرورت ہے جس کے بغیر چارہ کار نہیں ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ ملکیت کی یہ وہ بنیادیں بہر حال برقرار رہیں گی۔ چاہے زمانہ دستکاری کا ہو یا برقی آلات کا۔ ہوائی چکی سے کام لیا جاتا ہو یا بخاری مشین سے، انسان کے ہاتھ میں معمولی پتھر ہو یا پیچیدہ مشین یہ چیزیں انسان کو عدل وحق کا مفہوم نہیں سمجھا سکتیں بلکہ بعض اوقات عدل کی راہ سے منحرف کر سکتی ہیں اور انسان خلافت الٰہیہ کے تقاضوں کو کھلونا بنا سکتا ہے یہی وہ جگہ ہے جہاں نظامِ تقسیم پیداوار کے بڑھتے ہوئے وسائل سے خطرہ میں پڑ جاتا ہے اور تسخیر کائنات کے اسباب انسان کو استحصال پر آمادہ کرنے لگتے ہیں جس کے بعد نئے قوانین کی ضرورت ہوتی ہے کہ نئے آلات تقسیم کی عدالت پر اثر انداز نہ ہو جائیں۔

اس بنیاد پر سماج اور معاشرہ کے عناصر کو تین حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ بعض عناصر (قوانین) ثابت اور مستقل قسم کے ہیں جو تقسیم کے

نظام کو اجتماعی عدالت اور عمومی خلافت کی روشنی میں معین کرتے ہیں اور ان کی تصریح کتاب کریم اور سنت پیغمبر میں کر دی گئی ہے یا ان کا استناج منصوص اور مبینہ احکام سے ہوسکتا ہے جیسے ملکیت کا محنت اور ضرورت سے مربوط ہونا یہ ایک غیر مستقل عنصر ہے۔

۲۔ بعض عناصر متحرک اور متغیر قسم کے ہیں جو حالات کے تحت معین ہوتے ہیں اور جن کا تعلق نظام تقسیم سے لے کر جب پیداوار کی ترقی یافتہ شکل استحصال کے نئے راستے کھولنے لگتی ہے اور نظامِ تقسیم کے تباہ ہوجانے کا اندیشہ پیدا ہوجاتا ہے۔ اس کی واضح مثال حاکمِ شرع کی طرف سے زمین کی آبادکاری یا مصادر ثروت کے استفادہ کی آخری حد تک معین کر دیتا ہے۔ اگر پیداوار کی بڑھتی ہوئی رفتار اور جدید ترین آلات کی ایجاد استحصال اور ذخیرہ اندوزی کی طرف مائل ہوجائے جسے اسلام کسی قیمت پر برداشت نہیں کرسکتا۔ ظاہر ہے کہ حاکم شرع کا یہ اختیار ایک دائمی اور مستقل قانون نہیں ہے بلکہ ایک متحرک عنصر ہے۔ جسے بوقتِ ضرورت استعمال کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ بعض متحرک عناصر جن کا تعلق پیداوار اور اس کے ذرائع و آلات کی ترقی سے ہے کہ یہ عناصر ہمیشہ ترقی پذیر رہتے ہیں اور ان کے بارے میں کوئی جامد قانون وضع نہیں کیا جاسکتا۔ پیداوار کا تعلق انسانی معلومات سے ہے اور وہ روز بروز ترقی پذیر ہیں۔ لیکن ان عناصر کی بنیاد علم الاقتصاد ہے اور وہ تمام قوانین ہیں جو فطرت سے تعلق رکھتے ہیں اور پیداوار کے مسائل کی وضاحت کرتے ہیں۔ جیسے غلہ کی کمی کا قانون کہ اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ ایک علمی مسئلہ ہے جسے علمی قوانین کی روشنی میں حل ہونا چاہیے۔

اسلام نے پہلی قسم کے عناصر کے لئے مستقل احکام وضع کر دیئے اور دوسرے قسم کے عناصر کے لئے ایسے اشارے معین کر دیئے ہیں جن سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ اختیارات کن حالات میں استعمال کئے جاسکتے ہیں اور اس طرح مرحلہ تقسیم میں عدالت و انصاف کا مکمل انتظام کرلیا گیا ہے۔ رہ گیا پیداوار کے متحرک عناصر کا مسئلہ جسے ہم زمانی عناصر سے تعبیر کرتے ہیں تو اسے علمی بحثوں سے انسانی معلومات کے حوالے کر دیا گیا ہے

اور اسلامی معاشرے میں حکومت کا فرض ہے کہ وہ پیداوار کی ایسی اقتصادی تدبیر کرے کہ اس میں تمام جدید ترین معلومات فراہم ہو جائیں اور ان معلومات کا مقصد پیداوار کا اسلامی قوانین سے ہم آہنگ بنانا ہے۔

حکومت کا جہاں یہ فرض ہے کہ وہ پیداواری لائحہ عمل کی تشکیل میں ان تمام مواقع کو برطرف کرے جو علمی معلومات اور تجربات سے استفادہ کی راہ میں حائل ہوں اور ایک ایسا راستہ معین کرے جس کا قیام اعداد وشمار پر ہو، اسی طرح اس کا یہ فرض بھی ہے کہ سماج کی ''ثروت سے استفادہ کرنے'' کے موانع بھی برطرف کرے اور ان تمام ظواہر کو فنا کردے جو انسان کی ثروت پر کرامت وسیادت کی توہین کرتے ہوں۔ مثال کے طور پر ایسے قوانین وضع کرے جو اسلامی معاشرے کو اقتصادی غلامی سے آزاد کرا دیں اور تمام اقتصادی میدانوں پر اپنی ہی حکومت قائم کرلیں۔

اسلامی معاشرے کے اقتصادیات کے تفصیلی خاکہ کو پیش کرتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ بنیادی طور پر اسلامی اقتصادیات کے دونوں ابتدائی عناصر کی مکمل وضاحت ہو جائے کہ اس کے مستقل عناصر بھی سامنے آ جائیں اور متحرک عناصر بھی معلوم ہو جائیں جن کے عمومی اشارے پہلے سے طے ہو چکے ہیں۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

عام اصلاحات

ملکیت عام۔

ہر وہ ملکیت ہے جس کا تعلق اسلامی حکومت سے ہو اس حیثیت سے کہ وہ امت میں ایک منصب الٰہی کی حیثیت رکھتی ہو۔

ملکیت حکومت۔

نبی یا امام کے منصب کی ملکیت جس کا تعلق نیابتاً حاکم شرع سے بھی ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ شرعی قیادت کی صلاحیتوں کا حامل ہو۔

ملکیت امت۔

وہ ملکیت جس کا تعلق امت سے باعتبار امت ہو اور ہر دور میں برقرار رہے۔

رقبہ۔

وہ مرکزی علاقہ جس سے کوئی ثروت فراہم ہوتی ہو جیسے پانی کے کنویں، تیل کے چشمے وغیرہ کہ ان کا حساب پانی اور تیل سے الگ ہوتا ہے۔

عمومی مباحات۔

وہ فطری ثروتیں جنہیں ابتدائی طور پر کسی فرد یا جہت کی ملکیت نہیں قرار دیا گیا اور ان میں تمام تر معاشرہ کو استفادہ کرنے کا حق ہے بشرطیکہ مرکز اپنی اصلی عمومیت پر باقی رہے۔

شخصی ملکیت۔

وہ ملکیت جس کا تعلق فرد یا جہت سے ہو اور وہ فرد یا جہت اس سے استفادہ کے عوض امت یا حکومت کو معاوضہ دینے کی ذمہ دار نہ ہو۔

حق اولویت۔

وہ حق خاص ہے جو انسان ملکیت عام کے علاقوں میں حاصل کر لیتا ہے جس کے بعد اصل رقبہ عمومی ملکیت پر باقی رہ جاتا ہے اور شخص کو تصرف میں اولویت حاصل ہو جاتی ہے۔

امت کا عمومی حق۔

یہ وہی حق اولویت ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اسے فرد کے بجائے پوری امت بحیثیت امت حاصل کرتی ہے اور اس کا سلسلہ ادوار رقبہ کا رہے گا اور حق اولویت امت کے لئے ہوگا۔

(حیمٰی) حریم۔

طبیعی ثروتوں کے مصادر پر قبضہ یا غلبہ حاصل کر کے ملکیت حق پیدا کر لینا۔

آبادکاری (احیاء) اس عمل کا نام ہے جس کے بعد طبیعی مرکز پیداوار کے قابل ہو جائے۔ جیسے زمین کو کھودنا یا نالی وغیرہ بنا کر پانی پہنچانا کہ یہ زمین کی زندگی ہے یا معدنیات کا نمایاں کرنا اور اس کی جڑ تک پہنچنے کی راہیں ہموار کر کے اسے برآمد کرنے کے قابل بنانا کہ یہ معدنیات کا احیا ہے یا چشمہ تک پہنچنے کے لئے زمین کھودنا کہ یہ چشمہ کا احیاء ہے۔

عمومی علاقہ۔

وہ علاقہ ہے جو عمومی ملکیت کے حدود میں داخل ہو جیسے عمومی مباحات کا علاقہ

خصوصی علاقہ۔

وہ علاقہ ہے جو ملکیت کے دائرے میں داخل ہو۔

سرمایہ دارانہ پیداوار:۔

کسی مال کی ملکیت کو بغیر کسی مزید محنت کے ذریعہ آمدنی قرار دے لینا چاہے وہ مال نقد ہو یا زمین یا آلات پیداوار۔

ابتدائی پیداوار:۔

وہ پیداوار ہے جہاں عمل کرنے والا ابتدائی طور پر کام کرے اور پہلے سے کسی کا عمل شامل نہ ہو۔ جیسے زمینوں سے مال برآمد کرنے کا عمل یا زراعتی عمل بشرطیکہ بیج دوسرے کی ملکیت نہ ہو۔

ثانوی پیداوار:۔

وہ پیداوار ہے جہاں کاریگر کا عمل دوسرے شخص کے عمل کے بعد شروع ہوا ہو اور اس نے پہلے ملکیت کا حق پیدا کر لیا ہو دوسرے کی ملکیت میں داخل ہو چکا ہے۔ یہی حال آلات کے ذریعہ پیداوار کا ہے کہ آلات دوسرے کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ اور اس عامل کا کام اب شروع ہوا۔

مضاربہ:۔

کسی شخص کو دوسرے کو مال دے کر تجارت کے لئے آمادہ کرنا اس طرح کہ مال مالک کا رہے اور محنت عامل کی اور نتیجہ میں مقرر کردہ دونوں حصہ فیصدی کی نسبت سے شریک رہے۔ اسلام میں بنک کے کاروبار کے جواز کی یہی صورت ایک ہے۔ دوسری کوئی شکل نہیں ہے اور اس صورت میں شرح منافع پہلے سے طے نہیں ہو سکتی۔ کاروبار کا نتیجہ دیکھنے کے بعد ہی طے ہو سکتی ہے کہ اگر کوئی فائدہ نہ ہوا تو کوئی منفعت نہ ملے گی۔ (جوادی)

حیازت:۔

کسی مال پر کسی انداز سے قبضہ کر لینا۔

احتکار:۔

کسی شے کو اس ارادے سے روک لینا کہ اس کی قیمت بڑھ جائے چاہے وہ مال ہو کہ اس کی ذخیرہ اندوزی کی جائے یا محنت ہو کہ اس کی اسٹرائیک کی جائے۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

اسلامی اقتصادیات کے مکمل خاکہ کے بنیادی نشانات

مذکورہ بالا موضوع کی وضاحت کے لئے اسلام میں ثروت کے احکام کو حسب ذیل ابواب پر تقسیم کرنا پڑے گا۔

۱۔ فطری ثروت کے مصادر و مراکز کی ابتدائی تقسیم

۲۔ پیداوار اور اس کی تقسیم کا طریقہ

ا۔ پیداوار اسلامی اقتصادیات میں اس کی اہمیت

ب۔ ابتدائی پیداوار اور اس کی تقسیم کا طریقہ

ج۔ ثانوی پیداوار اور اس کی تقسیم کا اصول

۳۔ اموال میں تصرف

ا۔ اموال کا تبادلہ اور تبادلہ کی بنیاد پر تجارتی فائدے

ب۔ اموال کا خرچ اور ضرورت کے مطابق ان کا مصرف

۴۔ حکومت کی عمومی ذمہ داریاں

مصادر ثروت کی ابتدائی تقسیم

انسان جب کسی معاشرہ میں رہ کر عام طبیعت اور اس کی مختلف ثروتوں کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کے اندر فطری طور سے یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ فطرت پر قابو حاصل کر کے اسے اپنے لئے ذخیرہ بنا لے اور اس سے استفادہ کرے۔ وہ اسی جذبے کے تحت زمین پر قبضہ کرتا ہے۔ تیل کے کنویں پر تسلط حاصل کرتا ہے۔ جنگل سے لکڑیاں جمع کرتا ہے۔ کنویں یا نہر سے پانی حاصل کرتا ہے۔ صحرا یا پہاڑ سے پتھر اٹھالاتا ہے اور پانی سے مچھلی اور ہوا سے پرندوں کا شکار کرتا ہے۔ اور یہ سب باتیں اسی وقت پیدا ہوتی ہیں جب وہ اپنے کو ایک معاشرہ کے درمیان پاتا ہے۔ ورنہ تنہائی کی زندگی گزارتا ہوتا اور وہاں کوئی دوسرا انسان نہ ہوتا تو صورتحال دوسری ہوتی۔ اور اکثر حالات میں قبضہ تسلط برقرار رہتی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تنہائی کے ماحول میں بھی معدنیات یا نہر پر قبضہ کرنے کوئی عقلی سبب نہیں ہوتا کہ وہ تو بہر حال انسان کے اختیار میں ہے اور دوسرا مزاحمت کرنے والا نہیں ہے لیکن جنگل سے لکڑی لانے والا اور نہر سے پانی حاصل کرنے کی فکر بہر حال رہتی ہے کہ ان چیزوں سے استفادہ کرنا اپنے قبضہ میں لائے بغیر ممکن نہیں ہے اور ان کا حال زمین، معدن اور نہر جیسا نہیں ہے۔

یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قبضہ اور حیازت پہلی چند صورتوں میں صرف ایک ذخیرہ اندوزی اور جمع آوری کا عمل ہے۔ اسے واقعتاً اقتصادی عمل سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی تعلق پیداوار سے ہے۔ اور آخری صورتوں میں یہ ایک اقتصادی عمل ہے اور احتکاز (ذخیرہ اندوزی) نہیں ہے۔ چاہے بعد میں ذخیرہ اندوزی کی شکل کیوں

نہ پیدا کرے۔اس کے بعد اگر غور کیا جائے تو یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ قبضہ ذخیرہ اندوزی وہیں بنتا ہے جہاں اس کا تعلق ثروت کے مصادر ومراکز سے ہوتا ہے جس طرح زمین، معدن اور چشمے وغیرہ۔اس کے علاوہ دیگر حالات میں وہ ایک اقتصادی عمل رہتا ہے جس کا مقصد ذخیرہ اندوزی نہیں ہوتا جیسے وہ تمام مواقع جہاں محدود مقدار میں ثروت فراہم کی جاتی ہے۔نہر سے پانی لایا جاتا ہے، پہاڑ سے پتھر توڑا جاتا ہے، جنگل سے لکڑیاں فراہم کی جاتی ہیں، دریا سے موتی نکالے جاتے ہیں، دریا سے مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں کہ ان سب کا تعلق اقتصادی اعمال سے ہے احتکاز سے نہیں اور اس طرح طبیعی ذخیروں کی دو قسمیں ہوجاتی ہیں۔

ایک ان ذخیروں کے مصادر ومراکز، جیسے زمین، معدنیات، نہریں چشمے وغیرہ۔

اور ایک کائنات میں منتشر دوسری ثروتیں جیسے حیوانات، نباتات، جمادات وغیرہ کے ان سب سے حیازت کے ذریعہ استفادہ کیا جاسکتا ہے اور ان میں حیازت ایک اقتصادی عمل کا درجہ رکھتی ہے۔

واضح لفظوں میں پہلی قسم کو غیر منقول اور دوسری قسم کو منقول ثروت کہا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد ان تمام ثروتوں کی ملکیت کی طرف توجہ کی جائے گی اور اسلام میں ان کی صحیح نوعیت کا تعین کیا جائے گا۔

طبیعی مصادر ثروت

ان کی بنیادی طور پر چند قسمیں ہیں۔

۱۔ زمین جس میں جنگلات، قابل زراعت زمینیں اور وہ زمین جو قابل زراعت نہیں ہیں لیکن محنت ومشقت کے ذریعہ قابل زراعت بنائی جاسکتی ہیں سب شامل ہیں۔

۲۔ معادن۔یعنی وہ تمام مادی ذخیرے جو زمین یا سمندر کے اندر پائے جاتے ہیں جیسے تیل، سونا، چاندی، لوہا، نمک وغیرہ کی کانیں۔

۳۔ پانی کے مرکز جیسے نہریں، سمندر، بحیرہ، چشمے وغیرہ۔

پہلی دونوں قسموں کا تعلق عمومی علاقوں سے ہے جو حکومت کی ملکیت ہوتے ہیں اور تیسری قسم عمومی مباحات میں شامل ہے جس میں ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے ان میں کوئی شے شخصی ملکیت کے قابل نہیں ہے بلکہ اپنی عمومی ملکیت یا باحیت پر باقی رہتی ہے۔ صرف اس کے اجزاء سے استفادہ ہوسکتا ہے جس طرح کہ ان علاقوں میں اپنا ذاتی علاقہ اور حریم بنانے کا حق بھی نہیں ہے۔ پیغمبر اسلام علیہ السلام نے ایسے تسلط کو حرام کر دیا ہے اور صاف لفظوں میں اعلان فرمایا ہے کہ ''حرم صرف اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ہے اور کسی کے لئے یہ حق نہیں ہے''۔ یہ ایک ذخیرہ اندوز کی شکل ہے جس سے نہ کوئی ملکیت پیدا ہوتی ہے اور نہ کوئی خصوصی حق۔ ذخیرہ اندوزی اقتصادی عمل نہیں ہے اور ایسے عمل کے بغیر ملکیت کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔

آبادکاری کی بناء پر حق خاص اس لئے پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ ایک اقتصادی عمل ہے جس کے بعد زمین استفادہ کے قابل ہوجاتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص زمین کی کھدائی کرتا ہے، اس سے پتھروں کو صاف کرتا ہے، وہاں پانی کا انتظام کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس میں استفادہ کی صلاحیت پیدا کرتا ہے یا اس طرح اگر کوئی شخص کان کھودتا ہے اور اس کی جڑوں تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ معین کو استفادہ کے قابل بنادیتا ہے اور یہ سب باتیں انسانی محنت سے پیدا ہوتی ہیں جو اس نے زمین کی زندگی کی راہ میں صرف کی ہیں اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ آبادکاری اپنے محنت کش انسان کو حق اولویت عطا کر دیتی ہے اور اسے اپنے زندہ کئے ہوئے علاقے میں دوسروں سے زیادہ تصرف کرنے کا اختیار دے دیتی ہے یہ اور بات ہے کہ وہ بھی صرف اپنی ایجاد کا مالک ہوتا ہے۔ رقبہ زمین کا مالک نہیں ہوتا۔ اور دوسرے انسان کو اختیار دیتا ہے کہ اسی زمین میں دوسری جگہ زندہ کرسکے۔ بلکہ اگر پہلی آبادکاری کے آثار محو ہو گئے ہیں تو محنت کش کا اولویت کا حق بھی ختم ہوجائے گا اور ہر دوسرے شخص کو دوبارہ زندہ کرنے اور استفادہ کرنے کا حق رہے گا۔ کسی آبادکاری والے کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ طبیعی مصادر کو منجمد کردے یا اس سے

استفادہ میں تاخیر کرے کہ اس طرح اس کا حق زائل ہوجائے گا۔

رہ گیا پتھر وغیرہ سے نشانات بنا دینا تو اس سے حق اولویت بھی نہیں پیدا ہوتا اس لئے کہ اس کا نام آبادی نہیں ہے اور ایسے تمام اعمال جب تک آبادکاری کی حد میں نہ آ جائیں ان سے کوئی حق پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح کہ خود آبادکاری کا دائرہ بھی اسی علاقے تک محدود رہتا ہے جسے فی الحال زندہ کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد باقی حصے اپنی اصلی نوعیت پر باقی رہتے ہیں اور استفادہ بھی اسی نوعیت کا صحیح ہوگا جس نوعیت کی آبادکاری ہے کہ اگر زمین کو زراعت کے قابل بنایا ہے تو اس کے معدنیات یا دیگر ثروتوں سے استفادہ کرنے کا حق نہیں ہے جب تک دوسرے محنت نہ کریں۔ اس لئے کہ زمین پر زراعت کے لئے محنت کر کے اسے قابل زراعت بنا دینا اور اس سے معدنیات وغیرہ کا برآمد کرنا اور اس کے لئے دیگر قسم کی محنتوں کی ضرورت ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ عوام کو آبادکاری کے ذریعہ حق اولویت سے سرفراز کر دینا یہ حکومت کا ایک امکانی طریقہ ہے جس کے وہ زمینوں کی زندگی اور ان سے استفادہ کا انتظام کرتی ہے ورنہ اصل زمین گو بہرحال اس کی ملکیت ہے اور یہی وجہ ہے کہ اگر اس سے بہتر کوئی طریقہ استفادہ کا دریافت ہو جائے گا تو حکومت تمام حقوق کو برطرف کر کے براہِ راست میدانِ عمل میں آجائے گی اور زمینوں کی آبادکاری کا خود انتظام کرے گی۔

یہ بھی یاد رہے کہ آبادکاری سے مراد افراد کا براہِ راست عمل کرنا ہے جو جس قدر عمل اور محنت کرے گا اسے اسی قدر حق اولویت حاصل ہوگا اس سے مراد آبادکاری کا سرمایہ دارانہ طریقہ نہیں ہے کہ چار مزدوروں کو لگا دیا اور سارے نتائج کے مالک بن گئے۔ اس طریقہ کار سے کسی طرح کا حق پیدا نہیں ہوتا۔ حق صرف محنت کش کا ہوتا ہے بلکہ اگر وہ سرمایہ دار سے آلات کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں سے استفادہ کیا ہے لیکن حق اولویت اس کی طرف منتقل نہیں کر سکتا یہ اختیار صرف حکومت کو ہے کہ وہ افراد سے حق اولویت خرید سکتی ہے بلکہ نظام تقسیم کے متاثر ہو جانے کا اندیشہ ہو اور اجتماعی توازن خطرہ میں پڑ رہا ہو تو

محنت کشوں پہ اس حق کو فروخت کرنا واجب ہوگا اور انہیں اس محنت کی قیمت دے دی جائے گی جو اس زمین میں مجسم ہوگئی ہے جسے انہوں نے زندہ کیا ہے یا جو ان تک میراث یا معاوضہ وغیرہ کے ذریعہ پہنچی ہے بشرطیکہ قیمت کا تعین عمل کو براہِ راست ذریعہ پیداوار سمجھ کر کیا گیا ہو سرمایہ انداز پیداوار کی بناء پر نہیں۔

انتقال حق اولویت

اگر امت کو کسی طبیعی مصدر میں آبادکاری کی بناء پر اس علاقہ کے دارالاسلام میں داخل ہونے سے پہلے حق اولویت حاصل ہوجائے اور اس کے بعد یہ علاقہ اسی زندگی کے عالم میں فتح کے ذریعہ سرحد اسلام میں آجائے تو فرد کا حق اولویت ختم ہوجائے گا اور زمین ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امت کی ملکیت ہوجائے گی اور اس کا حق اولویت بھی تمام امت کی طرف منتقل ہوجائے گا جسے شرعی اصلاح میں ارض خراج کہا جاتا ہے کہ اگر اس کے آثار حیات ختم بھی ہو جائیں اور حکومت کی کوتاہی یا حاکمِ شرع کی میدانِ عمل سے غائب ہونے کی بناء پر وہ دوبارہ مردہ بھی ہوجائے تو بھی زندہ کرنے والا حق اولویت نہیں پیدا کرسکتا بلکہ حکومت کا فرض ہوگا کہ زمین کو دوبارہ تمام امت کے نام پر زندہ کرے اور کسی فرد خاص کو کوئی حق نہ دے۔

اس کے برخلاف اگر زمین کو کفار نے آباد کیا تھا اور اس کے بعد بغیر جنگ وجدل وہ مسلمان ہوجائیں اور زمین اسلامی علاقے میں داخل ہوجائے تو آبادکاری کا حق ثابت رہے گا اور صاحبانِ زمین کے مسلمان ہوجانے سے یہ حق زائل نہ ہوگا۔

زندہ مصادر طبیعت

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ مصادر طبیعت میں زندہ کرنے سے حق اولویت پیدا ہوتا ہے تو اس کے معنی ہیں کہ اگر یہ مصادر پہلے سے زندہ اور قابل استعمال و استفادہ ہیں گو ان میں کسی کا کوئی حق پیدا نہ ہوگا جیسے جنگلات ظاہری معاون، قابل زراعت زمینیں وغیرہ کہ ان میں کسی کا کوئی حق پیدا نہیں ہوتا اور نہ کسی شخص کو اذن امامؑ کے بغیر تصرف کرنے کا

حق ہے اس لئے کہ یہ تصرف استفادہ ہے۔آبادکاری نہیں ہے اور استفادہ دلیل اولویت نہیں ہوتا۔جس کے معنی یہ ہیں کہ جیسے شخص مجاز نے استفادہ ترک کر دیا اور حکومت نے اسے برطرف کر دیا ویسے ہی اس کا رشتہ زمین سے قطع ہو جائے گا اور زمین پلٹ کر اپنی اصل حالت پر آجائیگی۔

قاعدہ نمبرا

طبیعی ثروت کے تمام مصادر ومراکز عمومی علاقہ میں داخل ہیں اور ان میں افراد کا حق خاص صرف اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ کوئی ایسا عمل انجام دیں جس سے زمین قابل استفادہ ہو جائے اور آبادکاری کی حد میں آجائے اور وہ بھی براہِ راست ہو۔سرمایہ دارانہ انداز سے نہ ہو، دوسروں کے ذریعہ نہ ہو۔

منقول اموال

طبیعی ثروتوں کی دوسری قسم جسے منقول اموال سے تعبیر کیا جاتا ہے یہ اموال پورے معاشرے کے لئے مباح ہیں اور ان کی ہر طرح کی حیازت وجمع آوری چاہے وہ جنگل سے لکڑی توڑنے کی شکل میں ہو یا سمندر سے مچھلی پکڑنے کی شکل میں اقتصادی عمل کہی جاتی ہے اور اسے ذخیرہ اندوزی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔یہی وجہ ہے کہ منقول اموال میں حیازت وجمع آوری اسی طرح ملکیت کا کام کر دیتی ہے جس طرح غیر منقول مصادر میں احیاء اور آبادکاری۔منقولات کی حیازت اور غیر منقولات کی آبادکاری ایک ایسا عمل ہے جو مال کو قابل استفادہ بنا دیتا ہے اور ان اعمال کے ذریعہ فطرت میں ایک موقع استفادہ ایجاد کیا جاتا ہے جس کا حق صاحب ایجاد کو ہونا چاہیے یہ اور بات ہے کہ طبیعی مصدر آبادکاری کا عمل کرنے والے کے دائرۂ عمل سے کہیں زیادہ ہوتا ہے لہٰذا وہ پورے مصدر کا مالک نہیں ہو سکتا بلکہ اصل مرکز عمومی ملکیت پر باقی رہے گا اور دوسرے افراد کو اختیار رہے گا کہ وہ استفادہ کو مواقع پیدا کر کے مزید حق حاصل کر لیں۔

منقول اموال کی نوعیت یہ نہیں ہے۔ یہاں انسان عام طور سے اتنی مقدار میں پانی، لکڑی، مچھلی وغیرہ فراہم کرتا ہے جس کی اس کو ضرورت ہوتی ہے یا اس کی مقدار محدود ہوتی ہے تو وہ صرف حیازت اور قبضہ ہی کو پورے مال کے لئے دلیل ملکیت بنا سکتا ہے۔

یہ اور بات ہے کہ یہاں بھی سرمایہ دارانہ طریقہ قابل قبول نہیں ہے اور وہی حیازت اور قبضہ دلیل ملکیت جو انسان کی طرف سے براہِ راست عمل میں لایا جائے ورنہ اجیروں اور مزدوروں کے انداز پر شکاریوں کو کوئی سرمایہ اور آلات دے کر شکار پر قبضہ کر لینا دلیل حق و ملکیت نہیں ہے بلکہ حق و ملکیت شکاری ہی کے لئے رہے گا اور صاحب مال و آلات کو صرف اجرت لینے کا حق ہوگا۔ یہی حال اس صورت میں ہوگا جہاں مال انسان کے قبضہ میں آ جائے اور اسے کوئی زحمت یا محنت نہ کرنی پڑے تو جہاں بھی ملکیت پیدا نہ ہوگی ملکہ مال اپنی عمومی ملکیت پر باقی رہے گا۔

قاعدہ نمبر ۲

فطرت کی تمام منقول ثروتیں اسی وقت قابل ملکیت ہوں گی جب ان کی حیازت وجمع آوری کے لئے براہِ راست محنت کی جائے۔ اس کے علاوہ کوئی صورت وجہ ملکیت نہیں ہے جب تک مال مالک اصلی کی میراث بن کر یا معاوضہ کی وجہ سے منتقل نہ ہو۔

❋ ❋ ❋ ❋ ❋

پیداوار اور اس کی تقسیم کا ذریعہ

۱۔ اسلامی اقتصادیات میں پیداوار کی اہمیت

اسلامی نظامِ اقتصاد دوسرے تمام اقتصادی مذاہب کی طرح اس بات پر متفق ہے کہ پیداوار کو اہمیت دینی چاہیے اور اس کے اضافہ وارتقاء کا سامان فراہم کرنا چاہیے تاکہ روئے زمین پر خلافت اقتصادیہ کا حامل انسان فطرت کی خیرات و برکات سے مزید سے مزید استفادہ کر سکے۔

لیکن اسلام اس فریضہ کو اپنے مقاصد خلافت اور قانون شرافت وتمدن کے تحت انجام دینا چاہتا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ پیداوار میں اضافہ سماج کی سطح زندگی کو بلند کرنے، عوام کو زندگی کا حق دینے، اور خلافت الٰہیہ کے مقاصد کی تکمیل کرنے کی غرض سے ہو۔ وہ دوسرے اقتصادی مذاہب کی طرح پیداوار کو ذاتی طور پر کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ مثال کے طور پر سرمایہ داری میں پیداوار کا اضافہ ذاتی طور پر محبوب ومطلوب ہو چاہے اس کا معاشرتی فائدہ ہو یا نہ ہو اور اسلام میں یہ اضافہ اس وقت محبوب ہوتا ہے جب اسے رفاہِ عام کا وسیلہ، عدالت اجتماعیہ کا ذریعہ اور حیاتِ انسانی کی سہولت کا سامان بنا دیا جائے اس کے بغیر اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

اسی امتیاز کی بناء پر اسلام دوسرے اقتصادی مذاہب سے مختلف محاذوں پر الگ ہو جاتا ہے اور دونوں کے پیداواری موقف بھی متفرق ہو جاتے ہیں جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ اسلامی نقطہ نظر سے پیداوار کی ہر شکل اور اس سے پیدا ہونے والا سماج کا ہر نقشہ انسانی کرامت و شرافت اور اخلاقی اقدار و افکار سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ سرمایہ داری کی طرح عورتوں اور بچوں کو تھوڑی اجرت پر کام میں لگا کر پیداوار میں اضافہ کر لینا اور اخلاقی اقدار، عالمی زندگی اور عورت کے جذبہ تحفظِ آبرو کو قربان کر دینا اسلام کی نگاہ میں قطعاً قابل برداشت نہیں ہے۔

۲۔ اسلامی اقتصادیات میں پیداوار کا اضافہ بازار کی مانگ کی بنا پر نہیں ہوتا جیسا کہ سرمایہ دارانہ پیداوار کا مزاج ہے بلکہ اسلام میں پیداوار کے سلسلہ میں سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ سماج کو ان مواد کی کس قدر ضرورت ہے اور معاشرہ کس قدر احتیاج رکھتا ہے۔ بازار میں کوئی مانگ ہو یا نہ ہو۔ اسلامی شریعت میں ضرورت کے مطابق پیداوار میں اضافہ کرنا ایک مقدس فریضہ اور عبادت الٰہی ہے جس کے ذریعہ بندہ پروردگار سے قریب تر ہوتا ہے۔ یہاں ان تمام اقسام کی پیداوار کی مخالفت کی جاتی ہے جنہیں اہلِ دولت و ثروت اور تعیش پسند افراد اپنے عیش و عشرت کا سامان فراہم کرنے کے لئے پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اسلامی سماج کی پیداوار اس بات پر نہیں ہے کہ صالح معیشت کے اسباب فراہم کئے جائیں اور تعیش پسندی کے اسباب کا خاتمہ کر دیا جائے جب کہ سرمایہ داری کی پیداوار بازار کی مانگ اور خریداروں کی قوت خرید کو دیکھ کر آگے بڑھتی ہے اور نتیجہ میں تعیش پسندی کے سارے سامان اور زینت و آرائش کے سارے اسباب روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں اس لئے کہ انہیں اسباب کے خریدار زیادہ ہیں اور انہیں کی بازار میں مانگ زیادہ ہے۔ ضروریات زندگی کے خریدار غریب طبقہ کے لوگ ہیں اور ان کی قوت خرید کم ہے اور اس کے برخلاف تعیش کے سامان کے طلب گار دولت مند لوگ ہیں جن کی قوت خرید زیادہ ہے اب اگر پیداوار قوت خرید کی تابع ہوگئی تو بازار پر سامان تعیش کا قبضہ ہوگا اور ضروریاتِ زندگی دیکھنے میں بھی نہ آئے گی۔

۳۔ سرمایہ دار معاشرہ میں پیداوار کبھی کبھی مصنوعی ذخیروں کا شکار ہو جاتی

ہے اوراس سے نئے نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اوراس کی وجہ یہ ہے کہ اس معاشرہ میں پیداوارطلب کی پابند ہوتی ہے اورطلب کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ خریدار کو واقعی مال صرف کرنے کی ضرورت ہے بلکہ کبھی کبھی درمیان میں ایسے خرید بھی آجاتے ہیں جواپنی تنوع پسندی کی بنا پر بار بار چیزیں کراتے رہتے ہیں اور ہرکومختلف شکلوں میں پیدا کرکے ایک بےضرورت ذخیرہ فراہم کردیتے ہیں اورنتیجہ میں پیداوار کا بےمقصد ڈھیر لگ جاتا ہے جس کے بعد کارخانہ کے مالک کو بہت سا مال ازخود بربام کردینا ہوتا ہے تاکہ رسد وطلب کا تناسب برقرار رہے اورچیزوں کی افراط سے قیمت بالکل گرنہ جائے۔

اسلامی معاشرہ میں ایسے فریب کاروں کا گزرنہیں ہے۔ وہ پیداوار میں اضافہ ضرورت کو دیکھ کر کرتا ہے۔خریدار کو دیکھ کرنہیں۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ درمیان سے تمام طفیلی حضرات الگ ہوجاتے ہیں اورایجاد بقدرِضرورت کا فلسفہ بروئے کارآجاتا ہے۔معاشرہ ان تمام بلاؤں سے نجات پا جاتا ہے جوفرضی ذخیروں کی بنا پر پیدا ہوگئی ہیں اور پیداوار سیدھے سیدھے ضرورت کی راہ پرلگ جاتی ہے۔

قاعدہ نمبر ۳

پیداوارانسان کی خدمت کے لئے ہے۔انسان پیداوار کی خدمت کے لئےنہیں ہے۔

ب: ابتدائی پیداواراوراس کی کیفیت تقسیم

ابتدائی پیداوار میں ہمیشہ دوطرح کے عناصر کارفرما رہتے ہیں ایک وہ طبیعت جس پرانسانی محنت صرف ہوتی ہے اورایک وہ محنت جوطبیعت کی تسخیر وتعدیل میں صرف ہوتی ہے اوراس کے نتیجہ میں پیداوارظہور میں آتی ہے۔ان دونوں کے امتزاج کے بغیر پیداوار کا ظہور ناممکن ہے۔ پیداوار عدم سے وجود کا نام نہیں ہے۔فطرت کی چھپی ہوئی نعمتوں اورثروتوں کے اظہار کا نام ہے۔جواہرات زمین سے نکلتے ہیں، پانی چشموں سے

برآمد ہوتا ہے، مچھلی دریا سے پکڑی جاتی ہے بلکہ کبھی کبھی تو پیداوار میں طبیعت وعمل کے علاوہ ایک تیسرا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے جسے آلات و وسائل سے تعبیر کیا جاتا۔ جس کے بغیر پیداوار ناممکن ہے اور جو خود بھی کسی سابق عمل کا نتیجہ ہے۔

اسلام نے ابتدائی پیداوار کی تقسیم میں حسب ذیل باتوں کا لحاظ رکھا ہے۔

۱۔ پیدا ہونے والی ثروت کو محنت کش کی ملکیت قرار دیا جائے اور ملکیت کی بنیاد عمل کو تسلیم کیا جائے۔

۲۔ عامل آلات و وسائل کو استعمال کرتا ہے تو ان کی متعارف اجرت اس شخص کے حوالے کرے جس کی محنت سے آلات و وسائل عالمِ وجود میں آئے ہیں۔ اس لئے کہ اس نے گزشتہ عمل کے نتائج کو خرچ کیا ہے اور آلات سے فائدہ اٹھایا ہے۔ آلات و وسائل کے مالک کو اجرت ملنی چاہیے۔ پیداوار میں اسے حصہ لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

۳۔ پیداوار میں سے ایک حصہ حکومت کے نام الگ کر دیا جائے جسے طبعی مصادر کی اجرت فرض کیا جائے جس طرح کہ سرکاری زمینوں کا خراج یا پیدا ہونے والی ثروتوں پر مالی ٹیکس خمس وغیرہ ہوتے ہیں کہ انہیں سمندری ثروت اور سالانہ خرچ کے بعد ہر آمدنی پر عائد کیا گیا ہے۔

حکومت کا یہ حصہ عوام کی ضروت کی بناء پر ثابت کیا گیا ہے تا کہ ان کی عمومی ضروریات کو پورا کیا جا سکے اور سماجی زندگی کو خوشحال بنایا جا سکے۔ یہ ملکیت ضرورت کی بنیاد پر پیدا ہوئی ہے جو ملکیت کا ایک اسلامی سبب ہے اور اس منزل پر بھی اسلام راسمالیت اور مارکسیت سے الگ ہو جاتا ہے اور سب کے رشتے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے اصل حق محنت کش کا ہوتا ہے۔ آلات و وسائل صرف کرایہ کے حق دار ہوتے ہیں۔ پیداوار میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا اور سرمایہ داری کی نگاہ میں سب برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں اور پیداوار کے اعتبار سے محنت کش اور صاحب آلات میں کوئی فرق نہیں ہے جبکہ اسلام میں آلات کی حیثیت صرف خدام اور مددگاروں کی ہے۔ ملکیت میں ان کا کوئی

حق نہیں ہے۔اس مقام پر اسلام کا راستہ مارکسیت سے بھی الگ ہے کہ مارکسیت صرف عمل کو بنیاد قیمت قرار دیتی ہے اور اس کی نظر میں سارا حق محنت کش کو ملنا چاہیے ۔حکومتی جماعت کا کوئی حصہ نہیں ہے اس لئے کہ اس نے پیداوار میں کوئی حصہ نہیں لیا ہے اور نہ اس نے نئی متبادل قیمت پیدا کی ہے جبکہ ایسے حصہ کا نہ ہونا نظام کی بہت بڑی کمزوری ہے کہ رفاہِ عام اور عمومی زندگی کی ضمانت کا کوئی انتظام نہیں ہے اور اس حصہ کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ چنانچہ بعض مارکسی مفکرین نے حکومت کے اس حق کی توجیہہ اس طرح کی ہے کہ حکومت نے تاریخی تجربات کے ذریعہ اتنے معلومات فراہم کر دیئے ہیں کہ محنت کش کو اپنے اصولوں کی بناء پر نئی قیمت پیدا کرنے میں کافی مدد مل رہی ہے اور یہ تجربات وراثت یا معاشرت کی بناء پر محنت کش کے عمل میں شریک ہو گئے ہیں لہٰذا ان کا بھی ایک حصہ ہونا چاہیے لیکن سوال یہ ہے کہ تاریخی تجربات کا شمار اقتصادی اعمال میں کہاں ہوتا ہے۔ مارکسیت کی نگاہ میں قیمت کی بنیاد اقتصادی عمل ہے اور اقتصادی عمل سے مراد وہ محنت ہے جو پیداوار میں جذب اور فنا ہو جاتی ہے۔تاریخی تجربات انسان کے ذہن میں محفوظ رہتے ہیں کسی پیداوار میں جذب یا فنا نہیں ہوتے کہ انہیں پیداوار کے ایک حصہ دار کی حیثیت دے دی جائے۔ پیداوار میں صرف محنت کش کا ردِ عمل صرف ہوتا ہے جو اس نے پیداوار میں لگا دیا ہے یا وہ عمل صرف ہوتا ہے جسے اس نے اپنے کو آمادہ کرنے میں صرف کیا ہے اس کے علاوہ کسی شے کا دخل نہیں ہے۔جس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی اقتصاد کی انسانیت اور اس کا ایمان باللہ اور خلافت انسانی پر قیام اس بات کی دلیل ہے کہ ثروت کو عامل اور حکومت کے درمیان تقسیم کیا جائے تاکہ محنت اور طبیعت دونوں کا حق ادا ہو جائے اور پورا سماج زندہ رہ سکے۔جیسا کہ ارشاد احدیت ہوتا ہے

''اللہ اور رسول پر ایمان لاؤ اور اس مال میں سے خرچ کرو جس
میں اللہ نے تمہیں نائب اور خلیفہ بنایا ہے''۔

جس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام نے ایک طرف سرمایہ دارانہ طریقہ

پیداوار کی مخالفت کر کے یہ طے کر دیا ہے کہ اگر کوئی شخص مزدوروں کو اجرت اور آلات دے کر ان سے پیداوار کا کام لے کر ساری پیداوار پر قبضہ کر لے تو یہ قطعی غلط اقدام ہوگا۔ ایسا اقدام سرمایہ دارانہ نظام میں صحیح ہے اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دوسری طرف مارکسیت کی بنیادوں کا انکار کر دیا ہے جس سے پیداوار میں حکومت کا کوئی حق ثابت نہیں ہوتا اور عاجز و ناتواں افراد کی زندگی بے ضمانت ہو جاتی ہے۔

اسلام میں صرف ایک ہی موقع ایسا ہے جہاں سرمایہ دارانہ عمل کی نظیر ملتی ہے جسے مزارعہ کہا جاتا ہے۔ اور جس کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص کسان کو زمین اس شرط پر دے کہ وہ بیج اور محنت اپنی طرف سے صرف کرے اور پیداوار میں دونوں حصہ دار بن جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات اسلام کے عام نظام اقتصاد کے خلاف ہے اور یہی وجہ ہے کہ علماء اسلام کے ایک گروہ نے اس معاملے کو اصلاً صحیح نہیں قرار دیا اور بعض لوگوں نے صحیح قرار دیا ہے تو انہوں نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ اس کا حل اسلامی نظام کا متحرک عنصر ہے جہاں حالات کے تحت قوانین میں تغیر پیدا کر دیا جاتا ہے اور اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس قسم کے معاملات رائج نہ ہونے پائیں جیسا کہ خود پیغمبر اسلام نے اس طرح کے سرمایہ دارانہ طریقہ کو روک کر صاحب زمین سے فرمایا تھا کہ یا تو خود زراعت کرے یا زمین کو دوسرے کے حوالے کر دے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائے دوسرے کی محنت میں حصہ دار بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلامی قانون کے اس متحرک عنصر اور ولی امر کے اس اختیار کو شامل کر لینے کے بعد اسلامی نظام کا خاکہ مکمل ہو جاتا ہے اور سرمایہ دارانہ پیداوار کا سلسلہ یکسر ختم ہو جاتا ہے۔

قاعدہ نمبر ۴

ابتدائی پیداوار میں ثروت کی تقسیم دو بنیادوں پر ہوگی عمل اور ضرورت۔ اس کے علاوہ تمام سرمایہ دارانہ طریقوں کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔

ثانوی پیداوار اور اس کی تقسیم کا طریقہ

ثانوی پیداوار اور اس کی تقسیم کا مسئلہ دو قسم کے معاشروں میں اٹھایا جاسکتا ہے۔ ایک وہ معاشرہ جس میں اسلامی اقتصادیات کے قوانین نافذ ہوں مصادر ثروت اور پیداواری اعمال پر اسلام کی نگرانی ہو اور ابتدائی پیداوار کو اسلامی بنیادوں پر تقسیم کیا جا چکا ہو۔ اور دوسرا وہ معاشرہ جہاں اسلامی اقتصاد کے مطالبوں کے مطابق ابتدائی پیداوار کی تقسیم نہ ہوئی ہو اور نتیجہ میں افراد معاشرہ میں عظیم تفاوت پیدا ہو گیا ہو اور اجتماعی توازن کا رنگ بگڑ چکا ہو۔

پہلی صورت میں ثانوی پیداوار کا کام ابتدائی پیداوار سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ ثانوی پیداوار کے معنی یہ ہیں کہ خام مادہ ایک منزل عمل سے گزر چکا ہے اور ایک محنت کش کے عمل کے نتیجہ میں اس کی ملکیت بن چکا ہے اور اب دوسرا شخص اس مادہ کو نئی شکل دینا چاہتا ہے۔ روئی کو کاغذ بنانا چاہتا ہے یا لکڑی کو تخت کی شکل دینا چاہتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے کسی شخص کو اس مادہ میں نئے عمل اور نئی شکل دینے کا اختیار اسی وقت تک دیا جاسکتا ہے جب پہلا عامل راضی ہو جائے اور اس سے کوئی معاہدہ کر لیا جائے اس لئے کہ مادہ پہلے عمل کے نتیجہ میں ایک شخص کی ملکیت بن چکا ہے اور اب کسی کی ملکیت میں مالک کی مرضی کے بغیر تصرف نہیں ہوسکتا۔

یہیں سے اسلام اور مارکسیت کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں کہ مارکسیت پہلے عامل کو ثروت کا مالک تسلیم نہیں کرتی بلکہ اس کے عمل سے پیدا ہونے والی تبادلی قیمت کا مالک تصور کرتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے عامل کو اختیار ہے کہ وہ پہلے کی روئی کو کاغذ کی شکل میں تبدیل کر دے اور جب قیمت میں اضافہ ہو جائے تو روئی کی قیمت اس کے حوالہ کر دے اور کاغذ کی قیمت خود لے لے۔ اس میں کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے اور اس نظریہ کی بنیاد یہ ہے کہ مارکسیت عمل کے نتیجہ میں صرف تبادلی قیمت کی ملکیت کی قائل ہے۔ اصل مال کی ملکیت کی قائل نہیں ہے اور اس کا خیال ہے کہ عمل اور محنت سے صرف تبادلی قیمت پیدا ہوتی ہے لہٰذا عامل کو اسی کا مالک ہونا چاہیے۔ ثروت سے کوئی تعلق نہیں

ہے۔ ہر عامل نے ایک نئی قیمت ایجاد کی ہے اور ہر شخص اپنی قیمت کا مالک ہوسکتا ہے۔

مارکسیت نے اس نکتہ کو یکسر نظرانداز کردیا ہے کہ تبادلی قیمت صرف عمل سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ جنس کی منفعت اور اس کی طبیعی ندرت سے پیدا ہوتی ہے اب جس قدر ندرت پیدا کرنے میں زیادہ محنت کی ضرورت ہوگی اسی قدر قیمت زیادہ ہوگی اس لئے کہ محنت ندرت پیدا کردینے کا بہترین ذریعہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ سونے کی قیمت چاندی سے زیادہ ہے اس لئے اس کی فطری ندرت چاندی سے زیادہ ہے چاہے اس کے برآمد کرنے پر زیادہ محنت صرف نہ ہو اور اسی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک ندرت پیداواری عمل اور اس کی مقدار سے پیدا ہوتی ہے اور ایک خود فطرت سے حاصل ہوتی ہے اور دونوں مل کر ثروت کی بازاری قیمت کا تعین کرتے ہیں۔ اب اگر عامل کی ملکیت کو صرف قیمت کی مقدار تک محدود کردیا جائے اور جنس سے اس کا تعلق نہ رکھا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کو مکمل قیمت نہیں دی گئی۔ مکمل قیمت میں عمل اور طبیعت مال دونوں کی پیدا کردہ ندرت کا دخل تھا اور ملکیت میں ایک کو نظرانداز کردیا گیا۔ اسی لئے اسلام نے عمل کے تبادلی قیمت سے متعلق کرنے کے نظریہ کو غلط قرار دیا ہے اور اس کا نظریہ یہ ہے کہ عمل اصل ثروت کی ملکیت سے متعلق ہوتا ہے اور اس بنا پر روئی ایجاد کرنے والا صرف روئی کی قیمت کا مالک نہیں ہے بلکہ اپنے عمل کی بنا پر اصل روئی کا بھی مالک ہے اور جب وہ پہلے روئی کا مالک بن چکا ہے تو دوسرے شخص کو ثانوی پیداوار کا حق اسی وقت دیا جاسکتا ہے جب پہلا مالک راضی ہوجائے ورنہ ہوسکتا ہے کہ وہ خود ثانوی عمل کرنا چاہتا ہو یا کسی دوسرے شخص کو شریک کرنا چاہتا ہو تو ایسی صورت میں یا تو اعلانِ عام کردے گا کہ جو بھی اس ثروت میں ثانوی عمل انجام دینا چاہتا ہے وہ میرا شریکِ کار ہوسکتا ہے یا اپنے عمل کی مناسب قیمت معین کرکے باقی اعمال کے لئے دوسرے شخص کو اختیار دے دیگا اور حکومت اس معاہدہ کی نگرانی کرتی رہے گی کہ ذخیرہ اندوزی کا رجحان نہ پیدا ہونے پائے اور جب عمل کی کوئی قیمت اصل مال میں شرکت یا الگ سے اجرت کی شکل میں طے ہو تو حکومت کا فرض ہے کہ ذخیرہ اندوزی سے پیدا

ہونے والی فرضی ندرت کو حساب سے خارج کردے اور صحیح ندرت کا حساب کرے اس لئے کہ سرمایہ دار معاشروں میں ندرت ثابت کرنے کے لئے ذخیرہ اندوزی کو ذریعہ بنایا جاتا ہے اور ابتدائی مواد کو روک کرنا در بنا دیا جاتا ہے اور زندگی گزارنے کے لئے ہر وقت بازار میں پیش ہونے کے لئے تیار ہے۔ اب اگر ایسی فرضی ندرت کو لغو قرار دے اور ذخیرہ اندوزی کو فنا کردیا جائے تو عمل کی حقیقی قیمت سامنے آجائے گی اور دھیرے دھیرے ثانوی اعمال میں سرمایہ دارانہ پیداوار کا سلسلہ ختم ہوجائے گا اس لئے کہ سرمایہ دارانہ منافع خوری میں زیادہ دخل انہی فرضی ندرتوں کا ہوتا ہے جن کے نتیجہ میں مواد کا حصہ عمل سے کہیں زیادہ ہوجاتا ہے اور قیمتیں خواہ مخواہ بڑھ جاتی ہیں۔

اس مقام پر یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ سماج میں اسلامی نظام رائج ہوجائے اور ابتدائی پیداوار میں ثروت کی تقسیم اسلامی اصولوں پر ہوجائے تو ثانوی پیداوار میں سرمایہ دارانہ تناقضات کے پیدا ہونے کا امکان ہی نہیں رہ جاتا۔ یہاں کسی انسان کے لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ بے تحاشہ ابتدائی خام مواد یا وہ رقم جس سے ابتدائی خام مادہ فراہم کیا جاتا ہے حاصل کرلے اور نتیجہ میں ذخیرہ اندوزی کو ذریعہ بنا کر سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار رائج کردے۔

اسلام کی عظمت و برتری یہی ہے کہ وہ روزِ اوّل سے معاشرہ کا ایسا ڈھانچہ تیار کرتا ہے جہاں سرمایہ دارانہ استحصال کا امکان نہ ہو اور لوگ دوسروں کے حساب پر صاحب ثروت نہ بننے پائیں۔ ہر شخص کو اس کا حق ملے اور مزدور کو اس ثروت کا مالک قرار دیا جائے جو اس نے اپنے عمل سے پیدا کی ہے شاید اسی لئے امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ

''کوئی شخص حلال طریقہ سے دس ہزار درہم اکٹھا نہیں کرسکتا'' [۱]

یعنی جب تک سماج میں سرمایہ دارانہ طریقہ رائج نہ ہوجائے ذخیرہ اندوزی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

---

[۱] مقصد یہ ہے کہ دس ہزار سے مراد گنتی نہیں ہے بلکہ اتنی رقم ہے جس کی قوت خرید آج کے اعتبار سے اتنی ہی ہو جتنی کل مدینہ و مکہ کے معاشرہ میں دس ہزار درہم چاندی کی تھی

مقصد یہ ہے کہ اسلام نے روزِ اوّل سے اپنا نظام اس انداز سے مرتب کیا ہے کہ کسی فرد کو اتنی مقدار میں ثروت جمع کرنے کا موقع نہیں مل سکتا لیکن یہ یاد رہے کہ دس ہزار درہم سے مراد چاندی کی اتنی محدود مقدار نہیں ہے بلکہ اتنی مقدار میں سرمایہ کی قوت خرید ہے اور وہ بھی اس معاشرہ کے اعتبار سے جو اس وقت موجود تھا اور جس کی مجموعی قوت خرید بھی معلوم ہے۔

رہ گئے وہ آلات واسباب جو ثانوی پیداوار میں استعمال ہوتے ہیں تو ان کا حشر یہاں بھی وہی ہوگا جو ابتدائی پیداوار میں ہوا تھا کہ انہیں پیداوار میں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا بلکہ انہیں انسان کا خادم تصور کر کے ان کی اجرات دے دی جائے گی اور اجرت کا اسلامی فلسفہ یہ ہے کہ انسان نے ان کے اندر چھپی ہوئی ابتدائی پیداوار کی صلاحیتوں سے استفادہ کیا ہے تو اس کا فرض ہے کہ ان کی قیمت ادا کرے۔ برخلاف اصلی سرمایہ کے کہ اس کا سود لینا حرام ہے اس لئے کہ نقد میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور وہ جب بھی واپس ہوتا ہے اپنی اصلی حیثیت و مالیت پر باقی رہتا ہے۔ اور سرمایہ دار معاشروں میں اگر جنسی سرمایہ کی اجرت زیادہ ہو جاتی ہے تو اس کا راز وہ ندرت ہے جسے ذخیرہ اندوزی نے جنم دیا ہے اور جس کے خلاف اسلام نے مکمل طور پر اعلان جہاد کیا ہے اور اس نے طے کر دیا ہے کہ ایسے اسباب وآلات کی اجرت معین ہو جانا چاہیے تا کہ فرضی ندرت پیدا کرنے کا موقع بھی نہ مل سکے۔

۲۔ ثانوی پیداوار کی تقسیم کی دوسری صورت یہ ہے کہ اوّل پیداوار میں اسلامی نظام کا رواج نہ رہا ہو اور اس پیداوار میں ثروت کی تقسیم سرمایہ دارانہ بنیاد پر ہوئی ہو۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں ایسے افراد ضرور ملیں گے جنہوں نے پہلی پیداوار کی تقسیم میں ایسے مالی اور اقتصادی حالات فراہم کر لئے ہوں کہ ثانوی پیداوار کا خام مواد بھی اچھی خاصی مقدار میں براہِ راست بالواسطہ خریداری جمع کر لیا ہو اور اس طرح ثانوی پیداوار میں ابتدئی مواد کی ذخیرہ اندوزی کے ذریعہ استحصال بھی عین ممکن ہے بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ثانوی پیداوار کا چکر چلانے والوں پر اپنا ارادہ مسلط کر دیں اور انہیں اپنے ارادہ کا تابع بنا لیں۔ اس صورت میں احتکار اور ذخیرہ اندوزی کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ حکومت

قیمتوں کا تعین اس انداز پر کر دے کہ احتکار درمیان میں نہ آنے پائے اور اجتماعی توازن پلٹ کر آ جائے۔ وہ اپنے عمومی علاقوں سے استفادہ کرے اور شخصی کاروبار کو اس طرح پابند بنادے کہ ثانوی پیداوار میں افراد اقتصادی زندگی پر حاوی ہو کر احتکار نہ کرنے پائیں اور اجتماعی عدالت کے قوانین معطل نہ ہونے پائیں۔

قاعدہ نمبر ۵

ثانوی پیداوار میں استعمال ہونے والا مواد پہلی پیداوار کے مالک کی ملکیت پر باقی رہتا ہے جب تک معاہدہ کسی بناء پر ثانوی پیداوار کے عامل کی طرف منتقل نہ ہو جائے۔

قاعدہ نمبر ٦

آلات پیداوار اور عمل کی اجرت حکومت کی طرف سے معین کی جائے گی تاکہ سرمایہ دار کو فرضی ندرت کا اعلان کر کے ذخیرہ اندوزی کے ذریعہ اجرت بڑھانے کا موقع نہ مل سکے۔

قاعدہ نمبر ۷

جہاں بھی استثنائی حالات میں اجتماعی توازن خطرے میں پڑنے لگے وہاں حکومت کا فرض ہے کہ اپنی صلاحیت کے مطابق مداخلت کرے اور ایسے قوانین نافذ کرے کہ اجتماعی توازن پیدا ہو جائے یا محفوظ ہو جائے۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

تبادلہ اور خرچ

تبادلہ اور خرچ

انسانی معاشروں میں تبادلہ کی ضرورت اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ انسان سادہ ترین معاشرہ میں بھی اپنی جملہ ضروریات کو بذات خود ایجاد نہیں کرسکتا اور نہ اپنی جملہ ایجاد کو خرچ کرسکتا ہے۔ انسان کو یہ احساس بہرحال ہے کہ تقسیم کار کے اصول پر ہر شخص کے حوالے ایک مخصوص کام کردینا ہی کام کی خوبی اور اس کے ارتقاء بہترین ذریعہ ہے چنانچہ اس نے روزِ اوّل سے یہ دستور بنایا ہے کہ ہر شخص اپنی ضرورت سے زیادہ اشیاء ایجاد کرے اور دوسرے کی ایجادات پر قابو پانے کے لئے اپنی ایجادات کو ذریعہ بنائے۔ اپنا مال دے اور دوسرے کا مال لے۔ اس طرح تبادلہ کا کام ابتدائی دور میں جنسی تبادلہ کی شکل میں شروع ہوتا تھا۔ جہاں ہر شخص اپنی ضرورت سے زیادہ جنس ایجاد کرکے دوسرے صاحب ضرورت کو دے دیا کرتا تھا اور پھر اپنی ضرورت کی چیز اس سے لے لیا کرتا تھا۔ ہر شخص بیک وقت پیداوار بھی کرتا تھا اور خرچ بھی۔ ہر پیداوار ایک خرچ کے مقابلہ میں تھی۔ اور ہر خرچ ایک پیداوار کے مقابلہ میں تھا۔ کسی پیداوار والے کے لئے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اپنے مال کو ذخیرہ بنا سکے۔ اس لئے ذخیرہ کرنے کی صورت میں رفتہ رفتہ مال کی قیمت آجاتی تھی اور وہ خود بھی دوسرے کی پیداوار سے فائدہ اٹھانے کے لئے اپنی پیداوار کو صرف کرنے کا پابند تھا۔ یہ غیر ممکن تھا کہ وہ اپنا مال محفوظ رکھے اور دوسرے کا مال حاصل کرلے۔ تبادلہ صرف تبادلہ تھا اس کی کوئی افادیت نہیں تھی۔ اصل افادیت پیداوار کی تھی کہ اس کے ذریعہ دوسرے اعمال پر قابو حاصل کیا جاسکتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس جنسی تبادلہ کے دور میں تین طرح کے حالات سامنے آتے تھے۔

۱۔ پیداوار خرچ سے الگ نہیں ہوتی تھی۔ ہر خرچ سے پیداوار اور ہر پیداوار سے خرچ کا عالم وجود میں آتا تھا۔

۲۔ مستقل طور پر ذخیرہ اندوزی ناممکن تھی کہ اس طرح مال کی بربادی یا دوسری جنس سے محرومی ناگزیر تھی۔

۳۔ تبادلہ سے دوسری جنس حاصل کرنے کے علاوہ کسی شخص کو کوئی الگ سے فائدہ نہیں ہوتا تھا۔

لیکن جب سے سکہ نے تبادلہ کے عمل میں حصہ لیا اور قیمتوں کے تقرر کا کام شروع کیا۔ ان حالات میں بے پناہ تغیر پیدا ہو گیا۔ پہلی منزل میں ہر پیداوار والے کے لئے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ اپنی پیداوار کو نقد کے عوض بیچ ڈالے اور دوسرے کا مال نہ خریدے اور اس طرح پیداوار اور خرچ میں فاصلہ پیدا ہو گیا۔

دوسری منزل پر یہ دیکھنے میں آیا کہ نقد قیمت امتداد زمانہ سے گھٹتی نہیں ہے اور وہ ذخیرہ کرنے کے قابل ہے جس کے نتیجہ میں ذخیرہ اندوزی کا امکان پیدا ہو گیا۔

تیسری منزل پر خود تبادلہ بھی نئے فائدہ کی بنیاد بن گیا اور یہ کافی ہو گیا کہ انسان کے پاس کثیر رقم مال خریدنے اور زیادہ دام پر بیچنے کے لئے موجود ہو اور وہ بازار پر قبضہ کر لے چاہے اسے دوسری جنس کی کوئی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ اب آمدنی کا ذریعہ پیداوار نہیں ہے بلکہ سکہ ہے جس کے ذریعہ پیداوار پر قبضہ کر کے احتکار کے ذریعہ ندرت کا مظاہرہ کر کے زیادہ قیمت حاصل کر لی جا سکتی ہے اور سکہ ایک مستقل ندرت کی شکل اختیار کر سکتا ہے اور وہ بھی خرچ کرنے کے لئے نہیں بلکہ فائدہ کمانے کے لئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صاحبِ دولت نے دولت کو نئے فائدہ کا ذریعہ بنایا اور سکہ کو قرض دے کر تھوڑی مدت کے بعد زیادہ سکے وصول کرنا شروع کر دیئے اور سودی کاروبار کا آغاز ہو گیا۔

اسلام نے دیکھا کہ تبادلہ کا گذشتہ تینوں مراحل سے الگ ہو جانا نئے مصائب کا پیش خیمہ بن گیا۔ بازار کی سلامتی، اجتماعی توازن اور معدنیات کی فطری رفتار سب خطرہ میں

پڑ گئی اور ایک نیا نظام سامنے آ گیا۔ چنانچہ اس نے اپنے مستقل اور متحرک دونوں قسم کے قوانین کا سہارا لے کر ایک ایسی سیاست تشکیل دی جس سے ہر ممکن انداز پر ان انحرافات کا سد باب کیا جا سکے، سود کو قطعی طور پر حرام کر دیا اور یہ اعلان کر دیا کہ یہ فائدہ سکہ کی احتکاری قیمت کا نتیجہ ہے۔ اس میں قرض لینے والے نے کسی ایسے عمل سے استفادہ نہیں کیا جیسے قرض دینے والے نے سکہ کے اندر محفوظ کر دیا ہو۔ جس طرح کہ کدال کو کرایہ پر لینے والا اس وقت واپس کرتا ہے جب اس کی صلاحیت کا ایک حصہ فنا ہو چکتا ہے۔ اس صورت میں اس کا فرض ہے کہ اس صلاحیت کو صرف کرنے کی اجرت مالک کے حوالے کر دے۔ برخلاف سکہ کے کہ اسے قرض لے کر کسی پروجیکٹ میں لگانے والا جب مالک کو واپس کرتا ہے تو اس کی صلاحیت اور مالیت میں ذرہ برابر کمی نہیں آتی۔ اب اس کی اجرت یا اس کا فائدہ حاصل کرنا صرف سکہ کی احتکاری قیمت کی بناء پر ہے اور کچھ نہیں ہے اور اسے اسلام نے حرام قرار دے دیا ہے جس طرح کہ اسلام نے خود سکہ کی ذخیرہ اندوزی کو بھی حرام کر دیا ہے اور اس پر اکثر حالات میں ایک ٹیکس لگا دیا ہے تا کہ سکہ اپنی اصل حیثیت سے ہٹ کر احتکاری عمل، ثروت کی جمع آوری، قیمتوں پر حکومت وغیرہ جیسے کاموں میں نہ لگنے پائے۔

اسلام نے اس راہ میں یہاں تک احتیاط سے کام لیا ہے کہ طفیلی معاملات کو بھی لغو قرار دے دیا ہے کہ یہ معاملات پیداوار اور خرچ کے درمیان حائل ہو جاتے ہیں اور اقتصادیات کی فطری رفتار کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ کسی جنس پر قبضہ کرنے سے پہلے اسے فروخت کرنا جائز نہیں ہے تا کہ اس طرح تاجر کو بھی کوئی محنت کرنا پڑے۔ ایسا نہ ہو کہ صرف کاغذی کاروائی کر کے زیادہ قیمت پر فروخت کر دیا جائے اور اپنی طرف سے کوئی عمل شامل نہ کیا جائے۔ اس سلسلے کی روایات اگر چہ منافع کے بارے میں ہیں کہ کسی شے کو اجرت پر لے کر زیادہ اجرت پر دینا حرام ہے اور جنس کے بارے میں تذکرہ نہیں ہے کہ ایک قیمت پر خرید کر دوسری زیادہ قیمت پر بیچنا حرام ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ عمل اسلام میں قبیح نہیں ہے۔

تذکرہ نہ ہونے کی مصلحت شائد یہ ہو کہ دورِتشریع میں کرایہ داری کے سلسلے میں اس طرح کے اعمال رائج تھے اور جنس کے سلسلے میں اس طرح کے اعمال کا رواج نہیں تھا بلکہ یہ بات ممکن بھی نہیں تھی کہ انسان جنس کو فراہم کئے بغیر اور بازار میں لائے بغیر فروخت کردے۔ اس دور میں جنس کا فراہم کرنا، بازار میں پیش کرنا اس کا تحفظ کرنا تجارت کی ضروریات میں تھا اور یہ سب وہ محنتیں تھیں جن کے مقابلے میں قیمت بڑھائی جاسکتی تھی۔ اب اگر کسی دور میں معاملہ ان تمام زحمتوں سے بے نیاز ہو جائے تو زیادہ قیمت حاصل کرنا اس طرح ممنوع ہو جائے گا جس طرح زیادہ اجرت حاصل کرنا ممنوع تھا۔

مولائے کائنات نے اپنے ارشادات میں اپنے دور کے تجار کی ماہیت اس انداز سے بیان فرمائی تھی کہ یہ سب منافع کے مراکز سہولتوں کے فراہم کرنے والے ہیں۔ جہاں تک عام طور پر لوگ التزام نہیں کرتے۔

جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور کے تجار سرمایہ دارانہ انداز کے عادی نہیں تھے بلکہ محنت کش تھے اور خود سامان فراہم کیا کرتے تھے۔ اب اگر کسی دور میں اس کے خلاف معاشرہ پیدا ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی اقتصادیات کے متحرک عناصر کو جنس کے بارے میں بھی وہی راستہ اختیار کرنا پڑے گا جو ثابت عناصر نے منفعت کے بارے میں اختیار کیا ہے اور حاکمِ شرع کا فرض ہوگا کہ جب جنس میں اضافہ قیمت کا وہی رجحان پیدا ہو جائے جو اجرت میں ہوتا ہے تو فوراً اس پر پابندی عائد کردے کہ یہ اسلامی قوانین کا متحرک عناصر اسی دن کے لئے ہے کہ اس سے وقتی حالات کا علاج کیا جاسکے۔

قاعدہ نمبر ۸

نقد کو ذخیرہ وخزانہ بنانا حرام ہے۔

قاعدہ نمبر ۹

سکہ کی احتکاری قیمت کی روک تھام کے لئے عمل اور محنت ضروری ہے تا کہ سود کا راستہ بند ہو۔

قاعدہ نمبر ۱۰

اسلامی حکومت کی اقتصادی سیاست کا فرض ہے کہ پیداوار اور خرچ کے درمیان کے فاصلہ کو کم کر دے اور تبادلہ کو کسب منفعت کی بنیاد بننے سے روک دے تا کہ پیداوار اور عمل سے ہٹ کر کوئی ذریعہ اکتساب نہ رہ جائے۔

مصارفِ مال

اسلام نے جس طرح تبادلہ کی منزل میں کچھ پابندیاں عائد کی ہیں اسی طرح مال خرچ کرنے کے مرحلہ پر بھی کچھ حدود و قیود مقرر کر دیئے ہیں اسی طرح مال خرچ کرنے کے مرحلہ پر بھی کچھ حدود و قیود مقرر کر دیئے جہاں ایک طرف اسراف کو حرام کیا ہے اور دوسری طرف تبذیر کو ناجائز قرار دیا ہے۔

اسراف کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے سماج میں تکمیل ضرورت کے عمومی سامان سے زیادہ مقدار میں سامان خرچ کرے کہ ایسی صورت میں حکومت کا فرض ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ سامان پر پابندی عائد کرے اور اس طرح ان تمام امتیازات کو مٹانے کی کوشش کرے جو مختلف سطحوں کے درمیان پیدا ہو جاتے ہیں۔

اس کے ساتھ جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اسلام نے عمومی سطح زندگی کو بلند کرنے پر بھی کافی زور دیا ہے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام نے اجتماعی توازن کرنے کی پالیسی اختیار کی ہے اور مختلف آمدنی والے انسانوں کے درمیان کس طرح توازن برقرار رکھنا چاہتا ہے۔

یہ واضح رہے کہ اسراف ایک نسبی امر ہے جس کا تعلق رائج الوقت سطح زندگی سے ہے کہ انسان عمومی سطح سے آگے نہ بڑھنے پائے ورنہ یہ عین ممکن ہے کہ ایک معمولی معاشرہ کا اسراف دوسرے ترقی یافتہ اور خوشحال معاشرہ کا اسراف نہ ہو بلکہ سطح سے گرا ہوا اقدام ہو کہ

یہ انسان کے تصرفات کی مقدار کا معاملہ ہے۔

''تبذیر''اس سے ایک مختلف طریقہ ہے جہاں مقدار کا لحاظ نہیں ہوتا بلکہ کیفیتِ تصرف دیکھی جاتی ہے اور اسلام کا منشا یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے تصرفات کو اسلامی سماج کے قوانین سے باہر نہ جانے دے اور مال کو لغویات پر صرف نہ کرے۔ کتے پالنے کی رقم، کھیل کود کی رقم مختصر ہی کیوں نہ ہو اسلامی قانون کے اعتبار سے حرام ہے وہ اپنے ماننے والوں کو جہاں ایک طرف اسراف اور فضول خرچی سے منع کرتا ہے وہاں دوسری طرف ضرورت سے فاضل اموال کو راہِ خدا میں خرچ کر دینے کی دعوت دیتا ہے۔ سورہ بقرہ آیت نمبر ۲۱۹ میں ارشاد ہوتا ہے

''اے پیغمبر! یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ راہِ خدا میں کیا خرچ کریں فرما دیجئے جو ضرورت سے بچ جائے سب خرچ کر دیں''۔

اس کے بعد اجتماعی کفالت کے پیشِ نظر ہر کھاتے پیتے انسان کا یہ فرض قرار دیا کہ وہ مضطر و عاجز افراد کی کفالت کرے اور اس طرح روحانی اور عقائدی تربیت کے زیرِ سایہ ایک ایسا معاشرہ پیدا ہو جہاں مردِ مسلم کی نگاہ میں مال کا مصرف بے جا مقابلہ، مہمل اخراجات اور انداز زندگی میں تنوع و تلون نہ ہو بلکہ روئے زمین پر خلافت الٰہیہ کا احساس ہو اور ایک ایسی فضا پیدا ہو جائے جو اسلامی انقلاب سے ہم آہنگ اور اس کے نظریات سے متحد ہو۔ اسلام نے اسی ضرورت کے پیش نظر اخراجات کی ایک حد معین کر دی کہ کوئی شخص سارا مال راہِ خدا ہی میں نہ صرف کر دے۔ ارشاد ہوتا ہے''راہِ خدا میں صرف کرو لیکن اپنے نفس کو ہلاکت میں نہ ڈالو، حُسنِ عمل اختیار کرو اللہ حسنِ عمل والوں کو دوست رکھتا ہے''۔

''اپنے ہاتھوں کو گردن سے باندھ بھی نہ دو اور بالکل کھول بھی نہ دو کہ آخرت میں خالی ہاتھ بیٹھنا پڑے''۔

قاعدہ نمبر ۱۱

کسی شخص کی زندگی عام زندگیوں سے آگے بڑھ کر اسراف بھی نہ بننے پائے اور بالکل ہر بام بھی نہ ہوجائے۔

حکومت کی عمومی ذمہ داریاں

معاشرہ کی اقتصادی زندگی میں اسلامی حکومت کی ذمہ داریوں کی حد بندی دو طریقوں سے کی جاسکتی ہے۔

۱۔ اسلامی اقتصادیات کے ثابت و مستقل قوانین کے انطباق کی روشنی میں

۲۔ حالات کے تقاضوں کے مطابق متحرک عناصر کے خلاء کو پُر کرنے کے لئے اسلام کے عام اشارات کی روشنی میں

ان دونوں صورتوں میں ملا لینے کے بعد متعدد ذمہ داریاں منظرِ عام پر آجاتی ہیں

الف۔ اجتماعی ضمانت اور اجتماعی توازن کی ذمہ داری

ب۔ مجموعی علاقوں کی ذمہ داری کہ ان سے بہتر سے بہتر فائدہ کس طرح حاصل کیا جائے۔

ج۔ سماج کی پیداواری کیفیت کی نگرانی کہ مزاج پر قابو پانے کے لئے کون سے قوانین پیش کئے جائیں اور کن شرعی قوانین کے مطابق۔

اقتصادی سیاست مقرر کی جائے کہ سماج کی عمومی آمدنی میں اضافہ ہوجائے۔

د۔ جنس کی حقیقی تبادلی قیمت کا تحفظ، مختلف اعمال کی نگرانی اور احتکار و ذخیرہ اندوزی سے ہر لحاظ پر مقابلہ۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

ان ذمہ داریوں کی تشریح حسب ذیل ہے

اجتماعی ضمانت کی بنیاد یہ ہے کہ اسلام طبیعی ثروتوں سے استفادہ کرنے میں سارے معاشرہ کو برابر کا حقدار سمجھتا ہے اور کسی کے لئے کسی خصوصی امتیاز کا قائل نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کی ذمہ داری یہ ہے کہ پورے معاشرہ کے لئے معقول زندگی کا بندوبست کرے ہر ایک کو حیات کی ضمانت دے۔ اس کا صحیح راستہ یہ ہے کہ سماج میں جو لوگ کام کرنے کے قابل ہیں ان کے لئے کام فراہم کرے اور جو عاجز یا بیکار ہیں ان کے لئے غذا کا بندوبست کرے۔ اور اس کا ذریعہ خمس و زکواۃ کے مالی ٹیکسوں کے علاوہ وہ عمومی علاقے ہیں جنہیں اسلام نے اجتماعی ضمانت کے تحفظ کے لئے حکومت اسلامی کے حوالے کر دیئے ہیں اور ولی امر کو ذمہ دار قرار دیا ہے کہ ان علاقوں سے فائدہ اٹھا کر سماج کو زندگی کی ضمانت دے۔

سورہ حشر آیت ۶۔۷ میں ارشاد ہوتا ہے

''اور وہ اموال جو پروردگار نے اپنے پیغمبر کو جنگ وجدال کے بغیر عطا کر دیئے ہیں (وہ بھی اذنِ خدا سے ہیں کہ وہ اپنے رسولوں کو جن لوگوں پر چاہتا ہے مسلط کر دیتا ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے''۔

اہل قریہ سے جو مال بھی اللہ نے اس طرح اپنے رسول کو عطا کیا ہے وہ اللہ، رسول، صاحبان قرآبت، ایتام، مساکین، مسافران، غربت زدہ کے لئے ہے تا کہ مال صرف مالداروں کے درمیان گردش نہ کرے۔

اجتماعی توازن۔

اجتماعی توازن کا مطلب یہ ہے کہ اولاً تو حکومت زندگی کی ادنیٰ درجہ کی سہولت

سارے معاشرے کے لئے فراہم کرے اور جہاں جہاں حالات اس درجہ سے بھی گر گئے ہیں انہیں بلند کر کے اس عمومی سطح تک لے آئے جیسا کہ امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام نے والی مملکت کے فرائض کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

> والی مملکت مالِ زکواۃ کو لے کر ان آٹھوں قسموں پر صرف کرے گا جنہیں اللہ نے مصرف زکواۃ قرار دیا ہے۔ اور فقرا و مساکین کو اس قدر عطا کرے گا کہ سال بھر تک کے لئے مستغنیٰ ہو جائیں اور کوئی تنگی محسوس نہ کریں۔ اس کے بعد کچھ بچ جائے تو والی کے حوالے ہے اور کم پڑ جائے تو والی کی ذمہ داری ہے کہ اپنے پاس سے اتنا عطا کرے کہ وہ سال بھر کے لئے مستغنی ہو جائیں۔

اس روایت کا واضح سا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا آخری مدعا یہ ہے کہ اس کے معاشرہ کا ہر فرد معاشی اعتبار سے غنی اور مستغنی رہے اور اس کی ذمہ داری والی امر پر عائد کی گئی ہے۔

دوسری طرف اس نے خرچ پر پابندی عائد کی ہے اور عام معاشی سطح سے تجاوز کرنے سے منع کیا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ معاشرہ میں جو سطح زندگی ہر ایک کے لئے ممکن ہے اس سے کوئی شخص آگے نہ بڑھنے پائے جیسا کہ قاعدہ نمبر ۱۱ میں بیان کیا گیا ہے۔ ان دونوں باتوں سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام اجتماعی توازن کس طرح قائم رکھنا چاہتا ہے اور اس کا کس طرح انتظام کرتا ہے۔

تیسری منزل پر اس نے ثروت کی ذخیرہ اندوزی اور اس کے ایک خاص طبقہ کے پاس ہو جانے پر پابندی عائد کی ہے اور یہ کوشش کی ہے کہ ہر شخص کے لئے کام کے امکانات اور پیداوار کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہوں جس کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ کا فطری ارتقاء اس مخصوص اقتصادی ڈھانچہ کے اندر اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ سرمایہ دار معاشرہ کی طرح دولت ایک مقام پر جمع ہو جائے اور باقی معاشرہ محروم ہو جائے۔ اس نے اپنے قوانین کے انطباق کو اجتماعی ضمانت کا بہترین وسیلہ قرار دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر ابتدائی روک تھام کے نہ ہونے کی بناء پر ایسے حالات پیدا ہو جائیں اور سماج عدم توازن کا شکار ہو

جائے تو حکومت کا فرض ہے کہ اپنی شرعی صلاحیت کے اندر ایسے طریقہ اختیار کرے کہ توازن پلٹ آ جائے جیسا کہ مرسل اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کے طبقاتی نظام کو دیکھ کر اور وہاں انصار کی مالی برتری اور مہاجرین کی زبوں حالی کا ذکر کر کے ایسے قوانین نافذ کر دیئے تھے کہ توازن پلٹ کر آ گیا۔ آپ کا اعلان تھا کہ جن مہاجرین نے اپنے اموال و اولاد کو چھوڑ کر ہجرت کی ہے ان کی طرف سے مدینہ کے ان افراد کا فرض ہے کہ جن کے اموال ان کی ضرورت سے زیادہ ہیں کہ اپنے اموال کو دوسروں کی ضروریات پر صرف کریں۔ پھر عمومی علاقے بھی اس ضرورت کی تکمیل کے لئے بڑی حد تک مدد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

عمومی علاقوں کے بارے میں حکومت کی ذمہ داری اس طرح ثابت ہوتی ہے کہ ان علاقوں کو حکومت نے مسلمانوں کی امانت کے طور پر اپنے قبضہ میں لیا ہے اور ان کا مقصد ان الٰہی مقاصد کی تکمیل ہے جن کی طرف سورہ حشر کی آیت ۶۔۷ میں اشارہ کیا گیا ہے تو اب ولی امر کا فرض ہے کہ ان علاقوں کی نگرانی کرے۔ جدید ترین وسائل کے ذریعہ ان سے استفادہ کرے۔ ان کی اصلاح اور ارتقا کے لئے اسالیب اختیار کر کے ان کی پیداواری قوت میں اضافہ کرے تاکہ ان کے ذریعہ اقتصادی زندگی اسلام کے اہم ترین مقاصد کی طرف موڑی جا سکے۔

امیر المومنینؑ کا ارشادِ گرامی اس منزل پر سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جہاں آپ نے اپنے والی مالک اشتر کے نام فرمان جاری کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ تمہاری نگاہ زمین کی آبادی پر خراج جمع کرنے سے زیادہ ہے۔ اجمالی طور پر پیداوار کی حرکت کی نگرانی کی ذمہ داری اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ اسلامی سیاست کا پیداوار کی منزل پر منطبق کرنا بھی ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہی چیزیں پیدا کی جائیں جن کی ضرورت ہے اور اتنی ہی مقدار میں پیدا کی جائیں کہ ہر شخص کی ضرورت پوری ہو جائے۔ اس کے بعد پیداوار میں اسراف نہ ہونے پائے اس لئے کہ اسلام کی نظر میں جس طرح اخراجات میں اسراف جائز نہیں ہے اور کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر علمی اعداد و شمار کی بنا پر پیداوار کی صحیح نگرانی نہ کی گئی اور اس کو صحیح رُخ پر نہ لگایا گیا تو فوری طور پر پیداوار کی جنس یا مقدار میں اسراف ہو جائے گا اور اس کی روک تھام حکومت کا فرض ہے لہٰذا اس کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ پیداوار کے

عمومی حالات کی نگرانی کرتی رہے اور اسے ضرورت کے راستے پر لگاتی رہے جس طرح کہ اقتصادی ترقی کے لئے بھی ایک اقتصادی لائحہ عمل کا معین کرنا اور پیداوار کی سطح کا بلند کرنا اسلامی حکومت کا ایک فریضہ ہے جسے اپنی صلاحیت کے حدود کے اندر انجام دینا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آج دنیا میں اقتصادی قوت سب سے بڑی اجتماعی قوت تصور کی جاتی ہے جس سے معاشروں کی قدر و قیمت اور ان کی قوت وطاقت کا حساب لگایا جاتا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر بھی معاشی طاقت سے بڑی کوئی طاقت نہیں ہے اور قرآنِ حکیم کا کھلا ہوا اعلان ہے:

دشمنوں کے مقابلہ میں ہر امکانی قوت کا اہتمام کرو تا کہ اپنے اور خدا کے دشمن کو خوفزدہ کرسکو۔

آیت کا مفہوم فقط یہ نہیں ہے کہ میدانِ جنگ کیلئے طاقتوں اور اسلحوں کا انتظام کرو بلکہ ہر ایسی طاقت کا فراہم کرنا ضروری ہے جس سے اسلامی معاشرہ کا رعب ان جاہلی معاشروں کے دلوں میں پیدا ہو جائے جو ہر وقت موقع کی تاک میں رہتے ہیں اور کسی موقع کو فروگذاشت نہیں کرنا چاہتے۔ اور کھلی ہوئی بات ہے کہ دورِ حاضر میں ان تمام قوتوں میں اقتصادی قوت سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور اس کا عالمی اثر بھی زیادہ ہے لہٰذا حکومت کا فرض ہے کہ ایسی قوت بیش از بیش فراہم کرے تا کہ دشمن اسلام کو مرعوب و متاثر کیا جاسکے۔

تبادلی قیمت کی واقعی حیثیت اور عملی کی مختلف شکلوں کے تحفظ کی ذمہ داری بھی حکومت پر اس لئے عائد ہوتی ہے کہ اسلامی نظریہ کے مطابق قیمت کی پیداوار شے کی افادیت اور اس ندرت سے طے ہوتی ہے جس میں عمل کی مقدار اور کیفیت دونوں کا دخل ہوتا ہے اور جس قدر مال کی ایجاد میں زیادہ طولانی عمل اور دشوار گزار کام کی ضرورت ہوگی اس کی فطری ندرت زیادہ ہوگی اور اسی اعتبار سے قیمت بھی زیادہ ہو جائے گی۔ جس طرح کہ خود خادم مادہ بھی قیمت پر کافی حد تک اثر انداز ہوتا ہے کہ سونے کی قیمت کی زیادتی کا راز یہی ہے کہ اس کی کانیں چاندی کی کانوں کی بہ نسبت کم اور نادر ہیں۔

اس کے بعد جو ندرت احتکار اور ذخیرہ اندوزی افراد کے رسد وطلب پر قبضہ کر لینے کی بناء پر پیدا ہوتی ہے اس سے جنس کی وقتی قیمت یا عمل کی وقتی اجرت کے ذریعے طے

ہو جاتی ہے لیکن اس کا واقعی قیمت یا اجرت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ وہ قیمت ہے جس میں انسانی امداد کا دخل ہو گیا ہے اور اسے اس نے اپنے وسائل سے ایجاد کیا ہے۔

اسلام وقتی قیمت اور حقیقی قیمت میں فرق رکھنا چاہتا ہے اور اس کا منشاء یہ ہے کہ جنس اور عمل کی حقیقی شکلوں کا تحفظ کیا جائے تا کہ وہ حقیقی قیمت و اجرت محفوظ رہے جسے منفعت اور فطری ندرت نے پیدا کیا ہے اور اس انحراف کا مقابلہ کیا جا سکے جسے انسانی ہاتھوں نے پیدا کیا ہے اور جس کے ذریعہ حقیقی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ پیدا کر دیا ہے اور اس کی پشت پر ذخیرہ اندوزی کی ندرت اور فرضی حالات کے سوا کچھ نہیں ہے۔

امیر المومنینؑ نے مالک اشتر کے فرمان میں تحریر فرمایا تھا۔ یاد رکھو کہ بہت سے لوگوں میں واضح تنگی قبیح بخل اور منافع کی ذخیرہ اندوزی، تجارتوں پر بے جا حکومت کا جذبہ پایا جاتا ہے جو عمومی زندگی کے لئے مضرت کا دروازہ ہے اور والی کے لئے سخت عیب ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ ذخیرہ اندوزی کو روکو۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے ممنوع قرار دیا ہے۔ تجارت کو آسان اور عدالتی میزان کی بنیاد پر وسیع ہونا چاہیئے۔ بائع یا خریدار کسی پر ظلم اور زیادتی نہ ہو۔ تمہاری ممانعت کے بعد بھی کوئی شخص ذخیرہ اندوزی کرے تو اسے سزا دو۔ اس پر سختی کرو مگر یاد رکھو سختی میں بھی حد سے تجاوز نہیں ہونا چاہیے۔

قاعدہ نمبر ۱۲

حکومت کا فرض ہے کہ اسلام کے ثابت و مستقل قوانین کو منطبق کرے اور متحرک عناصر کو مقررہ اشارات کی روشنی میں بروئے کار لائے۔

قاعدہ نمبر ۱۳

ثابت متحرک عناصر کے انطباق کے سلسلے میں حکومت کے حسب ذیل فرائض ہیں۔

ا۔ معاشرہ کی ہر فرد کے لئے زندگی کی کم از کم ادنیٰ سطح کی ضمانت دے۔

ب۔ معیشت میں اجتماعی توازن قائم کرے۔ پست سطح کو بلند کرے اور آمدنی میں ذخیرہ اندوزی وغیرہ کو روک دے۔

ج۔ عمومی علاقوں سے جس قدر استفادہ ممکن ہو اس میں کوئی کوتاہی نہ

کرے اوراس کے لئے ایک عام لائحہ عمل معین کرے۔

د۔جنس کی قیمت اور عمل کی صورت کو حقیقی قیمت سے قریب تر کرنے کی کوشش کرتی رہے اور ہر طرح کے احتکار وذخیرہ اندوزی پر پابندی عائد کردے۔

زیرِنظر رسالہ اور گذشتہ رسالہ کے مطالعہ سے اسلامی معاشرہ میں صاحبانِ ایمان کی زندگی کا ایک خاکہ تیار کیا جاسکتا ہے اور یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں کس طرح کی سہولت اور عدالت پائی جاتی ہے اور اس کی پشت پر کتنے اہم مقاصد اور بلندترین اقدار وافکار کارفرما ہیں۔جن کی روشنی میں ایک ایسا انسان پیدا ہوسکتا ہے جو حق کی راہ میں ہر قربانی کے لئے آمادہ رہے اور کسی جہاد سے دریغ نہ کرے۔

اس کے بعد اپنے بیانات کا خاتمہ دعائے افتتاح کے ان فقرات پر کیا جارہا ہے جن میں اسلام کے زیرِ سایہ پلنے والے معاشرہ کا نقشہ دعا کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔اور پروردگار عالم سے التماس کی گئی ہے کہ وہ اپنے ولی امر کو ظاہر کرکے اس نقشہ کو بروئے کار لے آئے اور اسلام کو واقعی زندگی کی منزلِ انطباق میں قدم رکھنے کا موقع ملے۔

پروردگار ہماری پراگندگی کو اس امامؑ کے ذریعہ مجتمع فرمادے۔امت میں پڑے ہوئے شگاف کو جوڑ دے۔فصل کو وصل میں تبدیل کردے، ذلت کو عزت میں بدل دے، غربت میں استغناء عنایت کر۔خسارات کو پورا کردے۔زحمتوں کو آسان کردے۔اسیروں کو رہائی عطا فرما۔وعدوں کو مکمل فرما۔مطالبات کو پورا فرما۔تعمیر دنیا و آخرت کی امیدوں تک پہنچادے۔

اے بہترین مطلوب
اوراے وسعتیں عطا کرنے والے